۲۲۲۴ ۲۲۲۵

تذکرہ وقار الملک مرحوم

تذکرہ حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم

خرید کردہ وقف منصبیہ میرٹھ

زمانہ تولیت جناب خان بہادر مولوی سید محمد حسین خان صاحب شرق

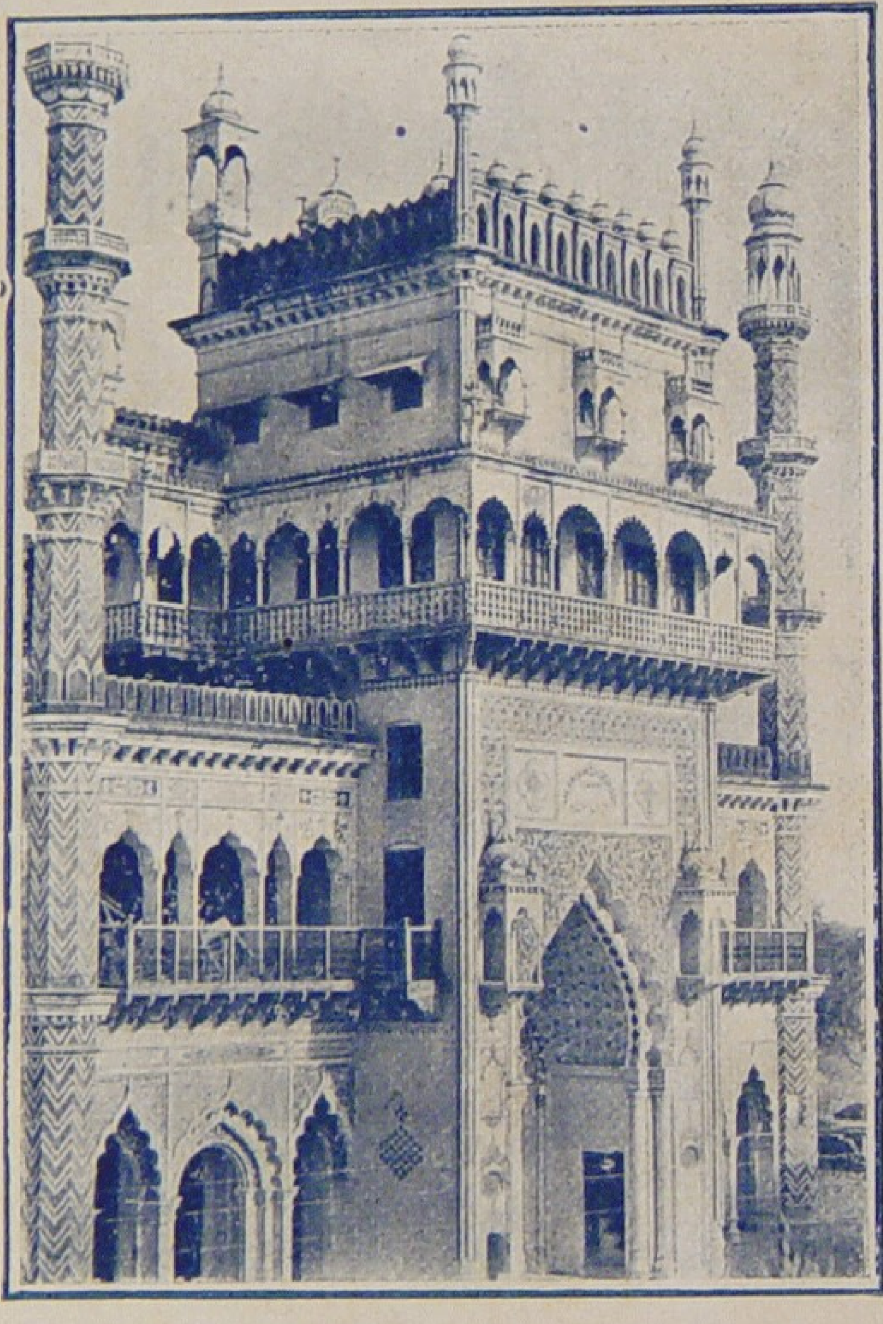
زیدی متولی وقف منصبیہ میرٹھ دام اقبالہ

قیمت رسید ۳۲۶۳ تاریخ ۳۰/۷   ۱۸۹

جلد ۳

احمد علی حسینی فاضل اکمل محمد

بشیر پاشا سیریز



اسلامیہ ہائی اسکول (اٹاوہ)

تذکرہ

نواب وقار الملک مرحوم

مرتبہ

محمد امین زبیری

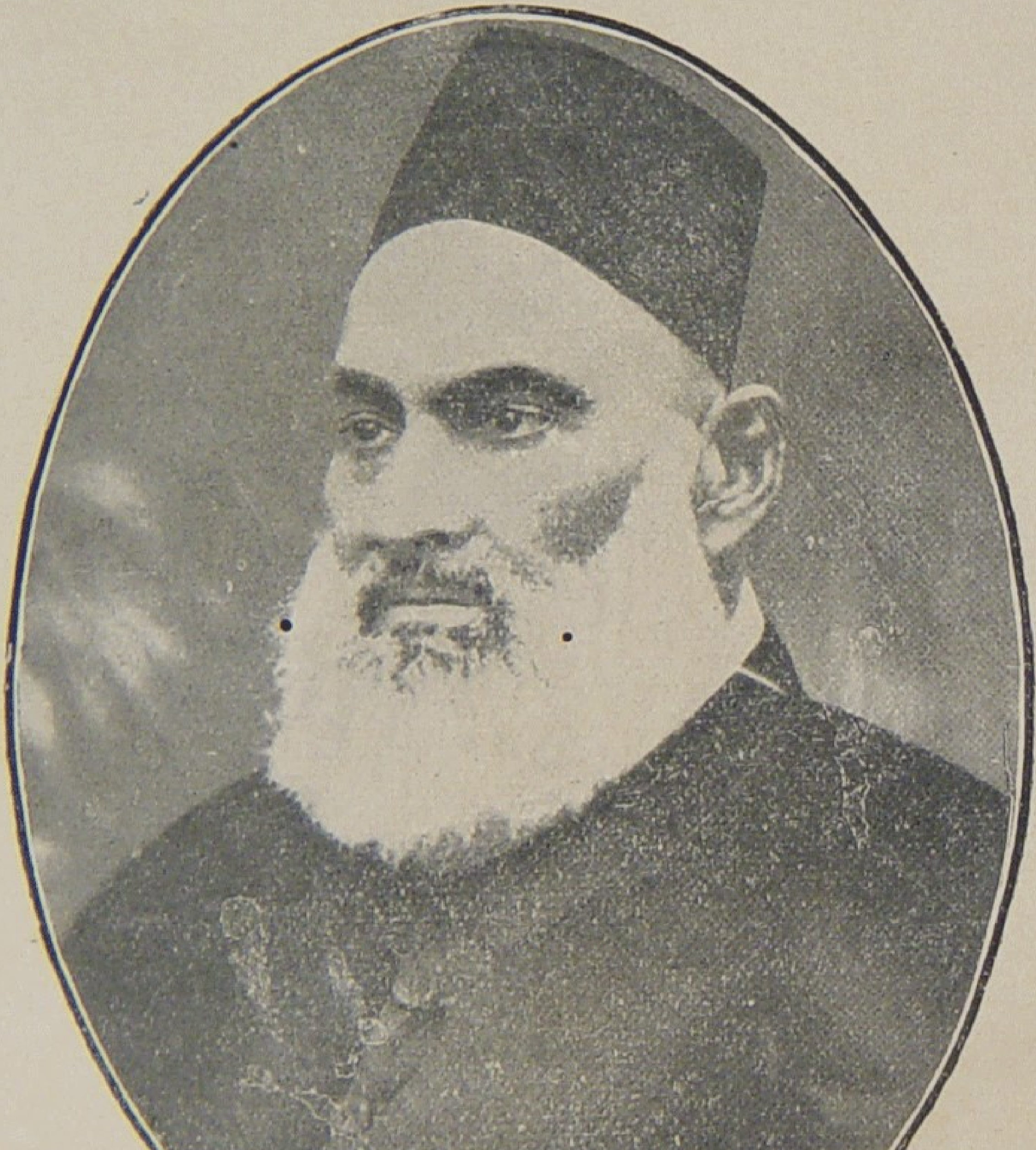
Title and inside Blocks printed by Taj Printing Works. Fort, Bombay.

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ

وقار المُلک

(مُسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ)



فہرست مضامین

صفحہ

(۱) پیدائش، تعلیم، انگریزی ملازمت ۱

(۲) حیدرآباد میں تقرر ۴

(۳) حیدرآباد سے علٰحدگی ۸

(۴) حیدرآباد میں دوبارہ تقرر اور صوبہ داری ۱۲

(۵) اصلاحات ۱۴

(۶) حیدرآباد میں خدمات اور مشکلات ۲۱

(۷) قومی کاموں میں مصروفیت، سرسید سے اختلاف ۲۶

(۸) علی گڈھ کالج کے معاملات ۳۴

(۹) دوسری پبلک خدمات ۳۸

(۱۰) سیاسی خدمات ۴۱

(۱۱) علی گڑھ کالج کی نظامت ۴۵

(۱۲) جنگ طرابلس، بلقان وغیرہ ۵۹

(۱۳) مرض کا آخری حملہ اور انتقال ۶۸

(۱۴) قوم کا عام ملال ۷۳

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جواں مرگ بشیر پاشا مرحوم بی اے بی ٹی کے نام سے معنون کرتا ہوں جس کی زندگی اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیلِ تعلیم کر کے اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسینؔ

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانانِ قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور اُن کے حوصلے بڑھانے کے لیئے اُن مشاہیر قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنھوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت مُؤثر ذریعہ ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ اعظم الرجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بہ کثرت شائع کیے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعے سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں۔

اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں اُن کے لائف اسکیچ شائع کیے جائیں

چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کیئے جاتے ہیں اور میں اُن عزیزوں
اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں اپنا وقت
صرف کر کے اور محنت اُٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر
دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے۔

میں اپنے پُر جوش نوجوان دوست سید عبد الجلیل صاحب کا جو بمبئی میں فنِ طباعت
کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے نہایت تنگ وقت میں
تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کیئے اور اپنی
نگرانی میں اُن کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہلِ قلم نوجوانانِ قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں
ہماری مدد کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

اِس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا۔

محمد الطاف حسین رضوی بی اے
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین خان بہادر انتصار جنگ

(۱)

۱۲۵۷ھ ۱۸۴۹ء میں امروہہ کے قریب ایک موضع میں نواب صاحب کی ولادت ہوئی ان کے والد شیخ فضل حسین تھے جن کا جدی سلسلہ دیوان عبدالمومن خاں سے ملتا ہی جو دربار شاہجہانی میں دیوان تن[1] کے منصب پر فائز تھے۔

نواب صاحب کنبوہوں کے اس خاندان سے تھے جو صوبہ متحدہ کے چند اضلاع[2] میں آباد ہی، اور خصوصیات و امتیازات کے لحاظ سے جس کی ایک شاندار تاریخ ہی، اور اس زمانہ میں بھی وہ تعلیمی خدمت کے لحاظ سے کچھ کم ممتاز نہیں ہی۔

---

[1] - عہد مغلیہ میں وزارت کے ہم پایہ یہ عہدہ تھا جمع خرچ سالانہ و ماہانہ عطائے جاگیرات و ترقیات مناصب کا اس سے تعلق تھا [2] - مارہرہ، میرٹھ، بریلی، امروہہ، سنبھل، اٹاوہ، لکھنؤ میں زیادہ آبادی ہی

نواب صاحب کی رضاعت کا زمانہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ اگرچہ ان کی ماں غیر تعلیم یافتہ تھیں لیکن قدیم شریف خاندانوں کی اعلیٰ تربیت کا نمونہ تھیں انھوں نے اپنے اکلوتے فرزند کی تربیت اخلاق پر بہت زیادہ توجہ رکھی اور جب وہ تعلیم کے قابل ہوئے تو ان کو مکتب میں بٹھا دیا، ریعانِ شباب تک اُنھوں نے فارسی، اور کسی قدر عربی کی بھی تعلیم حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ کچھ دن ابتدائی سرکاری مدرسہ میں بھی تعلیم پائی۔

چونکہ سرکاری ملازمت ہمیشہ سے اس تمام خاندان کا ذریعۂ افتخار تھا اس لیے ان کی توجہ بھی ملازمت کی جانب ہوئی اور جون ۱۸۵۹ء میں اسی مدرسہ میں جہاں خود تعلیم پائی تھی نائب مدرس کی عوض خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۸۶۰-۶۱ء کے زمانہ قحط میں اسٹریچی[۱] صاحب کلکٹر مرادآباد نے ضلع کے بڑے بڑے قصبات میں محتاج خانے قائم کیے تو امروہہ کے محتاج خانہ کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا اور اُنھوں نے اس خدمت کو نہایت دلسوزی سے انجام دیا رفتہ رفتہ صدر الصدوری علی گڈھ کے سررشتہ دار اور پھر منصرم ہو گئے یہاں ایک عرصہ تک سرسید کی ماتحتی میں بھی کام کیا۔ وہ ہمیشہ کام میں مستعد رہتے تھے اور کبھی آج کا کام کل پر اٹھا نہ رکھتے تھے، اکثر اوقات اپنے ساتھیوں کے پس ماندہ کام کو پورا کرنے میں امداد کرتے تھے دیانت و محنت و قابلیت ان کے وہ جوہر تھے کہ تمام حکام جن سے ان کو سابقہ پڑا ہمیشہ خوش اور معترف رہے۔

۱۸۶۷ء میں تحصیلداری کا امتحان دیا اور پھر سررشتہ دار کلکٹری اور نائب تحصیلدار ہوئے۔

۱؎ لیفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ جن کے نام سے کالج کا سٹرل ہال موسوم ہے

اسی میونسپلٹی کول (علی گڈھ) کی ممبری بھی گورنمنٹ صوبہ نے نامزد کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سر سالار جنگ اوّل مملکت نظام کی اصلاح کے لیے مختلف مقامات سے قابل آدمیوں کو منتخب کر رہے تھے اور سر سیّد کو بھی لکھا تھا کہ وہ بھی قابل آدمیوں کی سفارش کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے پہلے نواب محسن الملک کی اور پھر نواب وقار الملک کی سفارش کی۔ آخر الذکر سفارش کرتے ہوئے لکھا کہ:-

"مشتاق حسین ذہین، محنتی، ایماندار اور قابل حاکم ہی جس کو کافی تجربہ ہو چکا ہی مختصراً یہ شخص حضور والا کی ضرورت کے لیے بالکل موزوں ہے یہ صرف فوجداری دیوانی اور حساب کے ہی صیغوں میں کام نہیں کر سکتے بلکہ ہمیشہ اُس کام کے کرنے کو آمادہ ہیں جس کا حکم دیا جائے، میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کا تقرر ریاست کے لیے فائدہ کا باعث ہوگا اور حضور والا کو اُس وقت معلوم ہو جائیگا کہ مشتاق حسین کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہی اُس میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہی"۔

۱۸۷۴ء میں جب گورکھپور اور بستی میں امداد قحط کے کام جاری ہوئے اور سر سیّد اس کے نگراں کئے گئے تو اُنھوں نے سر جان اسٹریچی سے بطور خاص درخواست کر کے نواب صاحب کی خدمات اپنی امداد کے لئے حاصل کیں اور انھوں نے سر سیّد کے ساتھ رہ کر نہایت جانفشانی اور ہمدردی سے کام کیا کام ختم ہونے کے بعد علی گڈھ واپس آگئے۔

نواب صاحب ابتدا سے نماز کے سخت پابند تھے اور اوقات دفتر میں بھی کبھی ناغہ نہیں

کرتے تھے، گورکھپور سے واپسی کے بعد مسٹر کالون کلکٹر نے ایک مرتبہ ان کو روکا تو نواب صاحب نے تعمیل حکم سے صاف انکار کر دیا بالآخر استعفے پیش کرنے تک نوبت پہنچی لیکن معاملہ چھ مہینہ کی رخصت پر ختم ہو گیا، اسی دوران میں حیدرآباد سے طلبی کا حکم پہنچ گیا روانگی کے وقت مسٹر کالون نے ان کے متعلق یہ ریمارک کیا کہ: "میں نے چار مہینے ان کا کام دیکھا ہے اور میں ان کے کام سے بالکل مطمئن ہوں۔ یہ فرائض میں چست و ذہین ہیں میں نے ان کو نماز کے لئے پابندی سے اٹھتے ہوئے پایا جس سے مجھے سخت تکلیف تھی اور میں اجازت نہیں دے سکتا تھا چونکہ وہ اپنے خیال کو تبدیل نہیں کرتے اس لئے خوش قسمتی ہے کہ دیسی ریاست میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔"

(۲)

حیدرآباد میں نواب صاحب کا ابتدائی تقرر ناظم دیوانی کی خدمت پر ہوا اور رخصت ختم ہونے پر انگریزی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

نواب صاحب نے اس خدمت کے فرائض ایسی اعلیٰ قابلیت سے انجام دیئے کہ سر سالار جنگ نے ایک ہی سال بعد صدر المہام عدالت (جوڈیشل منسٹر) کی معتمدی پر ترقی دی اور معتمد عدالت نے تمام توجہ شعبہ عدالت کی اصلاح اور وضع قوانین و قواعد پر مبذول کی سب سے اول صوبہ اورنگ آباد کی عدالتوں کے اقتدارات و اختیارات و تنظیم آئین و رجسل خانجات کا معائنہ کرنے کے بعد ایک اصلاحی رپورٹ تیار کی اور پھر ۱۸۶۸ء میں عام انتظامات اور اصلاحات کے

متعلق ایک اہم یادداشت پیش کی۔ کاغذ ممہور کا اجرا کرایا جیل خانوں میں کارخانوں کے قیام پر توجہ دلائی، قیدیوں کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے واعظین کا تقرر کرایا اور اعمالِ مذہب ادا کرنے میں پوری سہولتیں بہم پہونچائیں اگرچہ ایک اعلیٰ عدالت "مجلس مرافعہ" ہائی کورٹ کے درجہ کی موجود تھی لیکن اکثر اپیلوں کی سماعت صدرالمہام عدالت و مدارالمہام بھی کرتے تھے اور یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ تھا کہ جس قدر اصلاح طلب تھا اُسی قدر مدارالمہام کے اختیارات کے سبب سے اس کی اصلاح کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر نواب صاحب نے تمام اندیشوں کو نظرانداز کر کے اس کی اصلاح اور طریقہ مرافعہ کی نگرانی پر نہایت قابلیت و بے خوفی سے توجہ دلائی مدارالمہام نے چند دلائل کے ساتھ اس اصلاح کو مسترد کر دیا لیکن نواب صاحب مایوس و مرعوب نہ ہوئے اور انھوں نے پُرزور دلائل و براہین کے ساتھ مدارالمہام کے دلائل کی تردید کی اور آخرالامر اپنی اصلاح کو منظور کرالیا اور عدالتی نظم و نسق کے متعلق نواب صاحب کی جملہ تجاویز منظور کی گئیں۔ نواب سر سالار جنگ (مدارالمہام) نے اپنے اختیار و اقتدار کو بالکلیہ مجلس مرافعہ کے سپرد کر دیا نظام عدالت کی ترتیب کی گئی قابل و مقنن عہدہ دار مقرر کئے گئے اور تصفیہ حقوق کا نظام مکمل ہوا۔ قواعد و قوانین کی ترتیب و تیاری کے لئے ماہرین قانون کی خدمات حاصل کی گئیں۔ صاحب بستان آصفیہ[له] لکھتے ہیں کہ

له۔ مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب ایک متعدد کتابوں کے قابل مصنف ہیں انھوں نے کئی جلدوں میں سلطنت آصفیہ کے مکمل حالات لکھے ہیں جس میں حیدرآباد کے نظم و نسق ملکی کی بھی مفصل تاریخ ہے اور جو تمام تر مستند اور سرکاری کاغذات سے ماخوذ ہے

"مولوی مشتاق حسین (نواب انتصار جنگ بہادر) معتمد صدر المہام مقرر ہوئے ان کے زمانہ میں صیغۂ عدالت کی اصلاح اور ریفارم کی تاریخ کی ایک نئی بنیاد پڑی آپ نے اپنی بے انتہا محنت اور فطرتی لیاقت سے ملک میں بہت سی ضروری اصلاحیں کیں اور عدالتوں کی طرز کارروائی بالکل بدل گئی اور آزادی حاصل ہوئی جو اس وقت تک نہ تھی۔ اُن کی ہی سفارش پر مدار المہام نے مقدمات کی نسبت اپنی مداخلت کو روکا اور حکام عدالت کی تنخواہوں میں اضافہ کیا ...... انھوں نے عدالتہائے تحت کی نگرانی کے لئے ایک کامل انتظام جاری کیا"۔

۱۹۰۰ء کے قحط میں سلطنت آصفیہ میں کارہائے امداد قحط کے لئے ایک صدر مجلس بنائی گئی تھی نواب صاحب بھی اس میں بطور ممبر شریک کئے گئے لیکن محتاج خانوں کا انتظام کلیتہً ان کے تفویض کیا گیا مختلف مقامات پر یہ محتاج خانے قائم کئے گئے اور نواب صاحب نے بذاتِ خاص مختلف اوقات پر پیہم معائنے کئے اور خود ذاتی نگرانی رکھی۔

ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے جدا جدا وارڈ تھے شیر خوار بچوں کا خاص انتظام تھا جن بچوں کی مائیں مر گئی تھیں اُن کی خدمت کے لئے عورتوں کو مقرر کیا گیا تھا، ان کے لئے دودھ کا معقول بندوبست تھا اور شیشوں سے پلایا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو محنت مزدوری کے قابل نہ تھے الگ اہتمام سے رکھے جاتے تھے ان کا لباس یکساں تھا بچوں اور مریضوں کی تفریح کے لئے سبزہ زار بھی بنائے گئے تھے حفظانِ صحت اور طبی امداد کا

کامل انتظام تھا اور اخلاقی حالت کی نگرانی بھی کی جاتی تھی نواب صاحب جب ان محتاج خانوں میں جاتے تو گھنٹوں محتاجین و مساکین اور خصوصاً بچوں کے ساتھ مصروف گفتگو رہتے۔ کبھی وہ ایک جگہ کھڑے ہو جاتے یا بیٹھ جاتے اور سبزہ زار میں بچوں کے کھیلنے کا تماشا دیکھتے اور اس وقت ان کے دلی جذبات قطرات اشک کی صورت میں آنکھوں سے نکلتے معلوم ہوتے۔ ان محتاج خانوں میں ۶۳۰۰۹ محتاج داخل ہوئے تھے جن میں ۳۷۷۸۴ معذور محض تھے۔

جو محتاج سڑکوں وغیرہ پر کام کرنے کے قابل تھے ان سے وہاں کام لیا جاتا تھا اور جو محتاج خانوں سے باہر جا کر کام نہیں کر سکتے تھے مگر کام کے قابل تھے ان کے لئے محتاج خانوں میں کام کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ان محتاج خانوں کا وقتاً فوقتاً عہدہ داران سرکار عالی کے علاوہ مدراس و بمبئی اور دوسری ریاستوں کے عہدہ داروں نے معائنہ کیا اور نہایت عمدہ ریمارک کئے۔ کارہائے قحط ختم اور محتاج خانوں کے شکست ہونے کے بعد نواب صاحب نے ایک مفصل رپورٹ صدر مجلس قحط کے سامنے پیش کی جو تقریباً سو صفحہ فلسکیپ پر ہے۔ صدر مجلس نے نواب صاحب کی ہمدردانہ کوششوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور سر سالار جنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ

"مولوی مشتاق حسین مسکین خانوں کے قائم کرنے میں تکلیف اٹھانے کے باعث حکومت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں اور ابتدا سے ہی مسکین خانوں کے عمدہ انتظام کا سبب ان کی ذات ہے۔"

اس کے بعد ۱۸۸۰ء کے کمیشن قحط کے سامنے ان کی تحریری شہادت بھی پیش ہوئی جس کے ساتھ مذکورہ بالا رپورٹ بھی منسلک تھی۔

(۳)

اس زمانہ میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس کی نابالغی کی وجہ سے عنانِ حکومت سر سالار جنگ اول کے ہاتھ میں تھی لیکن ان کے اور سر رچرڈ میڈ رزیڈنٹ کے تعلقات خراب تھے اور امیر کبیر نواب رشید الدین خاں کو سالار جنگ کی مرضی کے برخلاف شریک انتظام کر دیا گیا تھا اور (بقول سر اسٹوارٹ بیلی کے سی ایس آئی سر رچرڈ میڈ کا سر سالار جنگ کے برخلاف امیر کبیر سے مل جانا بہت افسوسناک ہوا اور گورنمنٹ ہند کو اس وجہ سے بہت سے ناگفتہ بہ کام کرنا پڑے"۔ اس حالت میں رزیڈنٹ اور وہ دونوں اس فکر میں رہتے تھے کہ شریک ریجنٹ کو جس طرح ممکن ہو اپنا ممنون و طرفدار بنا کے رکھیں۔

نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) صدر المہام عدالت اور امیر کبیر میں جو ایک ہی خاندان کے ارکان تھے خانگی نزاعات اور حقوق و مرتبہ کے متعلق تنازعات تھے نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) پر نواب صاحب کا خاص اثر تھا اور وہ ان پر بے انتہا اعتماد کرتے تھے اور ان کی رائے کو نہایت وقیع جانتے تھے ان تنازعات میں سر سالار جنگ نواب صاحب کے ذریعہ سے سر آسمان جاہ کو کچھ پیغامات بھیجتے اور وہی جوابات بھی لاتے اس طرح ایک خانگی معاملہ سے اُن کا تعلق پیدا ہو گیا اسی سلسلہ میں ایک موقع پر سر سالار جنگ نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی اصلی رائے کے خلاف

نواب بشیر الدولہ کے سامنے رائے ظاہر کریں لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا جس سے سر سالار جنگ کو کسی قدر ناگواری ہوئی نواب صاحب نے اس ناگواری کو محسوس کرتے ہی اسی گھنٹہ میں استعفاء پیش کر دیا اور سر سالار جنگ سے درخواست کی کہ "میں کل ہی اپنے وطن روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔" سر سالار جنگ نے درخواست ملاحظہ فرما کر فوراً یاد کیا جب نواب صاحب سر سالار جنگ کے محل پر پہونچے تو نواب محسن الملک اور نواب مکرم الدولہ نے جہاں تک ان سے ممکن تھا نواب صاحب کو سمجھایا کہ استعفاء واپس لے لیں لیکن ان کی کوششیں بے سود رہیں تو خود سر سالار جنگ نے اپنے سامنے بلایا اور کہا کہ "جو کچھ مولوی مہدی علی اور مکرم الدولہ نے تم سے کہا وہ انھوں نے میرا کہا ہوا نہیں کہا یہ ان کی اپنی رائے تھی میں نے تم کو کچھ اور ہی کہنے کو بلایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اُس وقت میں نے تم سے کہا وہ میری غلطی تھی مجھے کوئی حق نہیں تھا جو میں تم سے کہتا کہ جو کچھ تمھاری رائے نہ ہو اُس کو تم اپنی رائے کے طور پر بیان کرو اب میں تم سے اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہوں۔" جہاں اس واقعہ سے نواب صاحب کی حقیقی دیانت و جسارت اور کیرکٹر کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس مدبر اعظم کے دل کی نیکی اور حقیقی قدر شناسی کا نقش بھی دل پر قایم ہو جاتا ہے اس گفتگو کا لازمی نتیجہ تھا کہ نواب صاحب استعفاء واپس لیں ان پر ایک رقت کا عالم طاری ہو گیا جس کے اثر سے خود سر سالار جنگ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور انتہا درجہ کی محبت و نوازش اور مربیانہ شفقت کا اظہار کیا۔

مخالفین نے امیر کبیر کے ذہن نشین کر دیا کہ مولوی مشتاق حسین ہی نواب سر آسمان جاہ کو مدد دیتے ہیں اس لیے ان کی یہ خواہش ہوئی کہ ان کو اس خدمت سے علیحدہ کر دیا جائے

تاکہ نواب بشیر الدولہ کو امداد نہ مل سکے سر رچرڈ میڈ نے بھی امیر کبیر کی تائید کی لیکن سر سالار جنگ اس کو ٹالتے رہے اسی دوران میں نواب صاحب بحصول رخصت وطن آئے راستہ میں کرنل ٹوٹڈی رزیڈنٹ گوالیار سے ملاقات کی جو نواب بشیر الدولہ کے خاص احباب میں تھے اور حیدرآباد میں فرسٹ اسسٹنٹ رہ چکے تھے اس ملاقات کی اطلاع کسی طرح امیر کبیر اور سر رچرڈ میڈ کو مل گئی اور اس سے انھیں اپنی ضد پوری کرانے کا کافی موقع مل گیا انھوں نے دوبارہ سر سالار جنگ پر تقاضا کیا اور یہاں تک زور دیا کہ آئندہ ان میں اور سر سالار جنگ میں باہم تعلقات کا دوستانہ حالت میں رہنا صرف اس برخاستگی پر منحصر ہے۔

نواب صاحب کو جب ان واقعات کی اطلاع پہونچی تو انھوں نے سر سالار جنگ کو لکھا کہ

"میں نہیں چاہتا کہ مشتاق حسین وہ شخص قرار پائے جس پر مدار المہام اور ان کے شریک رزیڈنٹ کی باہم نااتفاقی کی بنیاد قایم ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے آپ بے تامل اس وقت شریک مدار المہام کی خواہش پوری کر دیجیے اور مجھ کو اس سے کچھ رنج نہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی کیونکہ میں سمجھونگا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی۔"

نواب صاحب اس خدمت سے علیحدہ کئے گئے اور انھوں نے علیگڑھ میں قیام اختیار کیا اس زمانہ بیکاری میں نواب صاحب مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے سر آسمان جاہ نے

مختلف طریقوں سے باصرار امداد کرنی چاہی لیکن نواب صاحب نے اس امداد کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سر سالار جنگ کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک خط میں جو کچھ لکھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "ہمہ را دیدم و خوش شدم کہ از شرفاء غیر از آنچہ از مولوی مشتاق حسین عمل شد دیگرنمی تواند شد و امید است کہ روزے بیاید کہ ایشاں نتیجۂ عمل خود را حاصل کنند"۔ ساتھ ہی جب تک کوئی دوسرا انتظام ہو چار سو روپیہ ماہانہ اپنے پاس سے مقرر کیا مگر نواب صاحب نے اس رقم کو اپنی ضروریات سے زیادہ تصور کر کے اس کو کم کرنے کی درخواست کی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ یہ جو کچھ امداد ہو بطور قرض متصور ہو لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور تاریخ علیحدگی سے سکریٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا گیا۔ سر سالار جنگ کی ہدایت سے اس دوران میں نواب صاحب نے سررشتہ مال کے قواعد و ضوابط کی ترتیب اور عدالت دیوانی سے صیغۂ مال کے کام کو علیحدہ کرنے کے متعلق گشتیوں اور ہدایتوں اور مسودہ قانون مالگزاری کو مرتب کیا اور تہذیب و ترتیب دفاتر کے دستور العمل پر نظر ثانی کی۔

ساڑھے تین برس میں بہت سے انقلابات ہوئے امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سر رچرڈ میڈ تبدیل ہو گئے۔ سر سالار جنگ نے اول ہی موقع پر نواب صاحب کو طلب کیا اور باضابطہ حکم جاری کرنے کے بجائے اپنے قلم خاص سے حسب ذیل خط ان کے نام بھیجا۔

"عدالت پناہ! بوجوہ و اسبابے کہ رسیدن آں مہرباں برائے چندے مناسب نبود بہ سبب شدن فیصلۂ مقدمۂ نواب بشیر الدولہ بہادر مرفوع شدہ و انتظام جدید در پیش است و آں مہرباں رکن مجلس عدالت کہ بہ طرز انتظام جدید عنقریب خواہد شد

قرار خواہند یافت نظر بر آں بہ خوشنودی تمام نوشتہ می شود کہ بمجرد رسیدن
حکم ہذا روانہ شدہ دریں جا بر سند کہ در بندوبست حالیہ ازاں عدالت
پناہ بہ سبب تجربہ سابقہ فائدہ حاصل خواہد شد زیادہ چہ بقلم آید۔

المرقوم بست و ہفتم جمادی الاول ۱۲۹۹ھ

سالار جنگ"

نواب صاحب فوراً روانہ ہو گئے لیکن بجائے رکن مجلس عدالت کے اپنے پہلے عہدہ پر مامور کئے گئے اور پھر چند ہی دن بعد گلبرگہ کے صدر تعلقہ دار مقرر ہوئے مگر اسی مہینہ میں سالار جنگ نے اپنا خاص معتمد عدالت و کوتوالی مقرر کر کے واپس بلا لیا اور بقول صاحب "بستان آصفیہ" "نواب صاحب (سر سالار جنگ) مرحوم نے صیغہ عدالت کے ریفارم کی طرف مولوی مشتاق حسین کی معتمدی کے زمانہ میں خاص توجہ مبذول فرمائی۔ مگر قبل اس کے کہ اس کا پورا انتظام ہو انھوں نے انتقال فرمایا"۔

(۴)

سر سالار جنگ اول کی رحلت کے ایک سال بعد اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کے تخت نشین ہوتے ہی میر لائق علی خاں "عماد السلطنت سالار جنگ ثانی" کے خطابات کے ساتھ منصب وزارت پر فائز ہوئے تو نواب وقار الملک کا سمت شرقی کی صوبہ داری پر تقرر ہوا انھوں نے اس صوبہ میں خاص اور اہم اصلاحات کیں سب سے پہلا کام

یہ تھا کہ مستقر صوبہ کو ورنگل کے نام سے موسوم کیا جس نام میں کہ اس کی قدیم عظمت و شہرت مضمر تھی انھوں نے زرعی آبادی کی حالت پر خاص توجہ کی ان کی ضرورتوں اور اور تکلیفوں کو طویل دوروں میں بالمشافہ گفتگوئیں کر کے معلوم کیا اور مناسب حال انتظامات کئے آبپاشی کے منہدم ذرایع کو درست کرانے اور جدید ذرایع مہیا کرانے پر خاص زور دیا اور گورنمنٹ سے اس غرض کے لئے دولاکھ روپیہ کی منظوری حاصل کی اسی قریب زمانہ میں جب سالار جنگ ثانی نے دورہ کیا تو ان کو موقع پر تمام ضروری اور اصلاح طلب اُمور پر توجہ دلائی وہ نواب صاحب کے انتظامات اور تجاویز سے بہت متاثر ہوئے اور جب وہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو ایک طولانی خط اپنے قلم خاص سے لکھا جس کا آخری جملہ یہ تھا کہ

"بالآخر اظہار این معنی ضروری می شمارم کہ درین دورہ قلیل المدت
آنچیکہ واقفیت از انتظام و کارگزاری آں مہرباں حاصل نمودم ازاں بے انتہا
خورسند شدم و امید بلکہ اطمینان کامل دارم کہ سمت شرقی در ایام حکومت و
نگرانی آں مہربان رشک دیگر اسمات سرکار عالی خواہد شد۔"

نواب صاحب نے مستقر صوبہ کو از سر نو آباد کرایا ایوان صوبہ داری کی رفیع الشان عمارت بنوائی سڑکیں، شفاخانے، مدرسے اور دیگر سرکاری مکانات تعمیر کرائے چوپڑ کا بازار تیار کرایا جو انتصار گنج کے نام سے موسوم ہے اس کے وسط میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ سرکاری طور پر ایک یتیم خانہ بھی اس اصول پر قائم کیا گیا کہ جب سرکار لاوارث مال کی

مالک ہوتی ہے تو لاوارث بچوں کی کفالت بھی اُسی کے ذمہ ہونی چاہیئے۔" اور صدور حکم منظوری تک اس کے اخراجات خود برداشت کئے صوبہ بھر سے بیگار کا نام و نشان مٹا دیا۔ زراعت کی ترقی اور ویران مقامات اور جنگلوں کی آبادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا اور نہ صرف وہ رعایائے سرکار عالی جو علاقہ سرکار انگریزی میں آباد ہوگئی تھی پھر اپنے وطن میں واپس آگئی بلکہ سرحدی اضلاع انگریزی کی رعایا نے بھی اس صوبہ میں سکونت اختیار کر لی جس سے ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں بمقابلہ مردم شماری ۱۸۸۱ء کے تقریباً چار لاکھ نفوس کا اضافہ ہوگیا غرض چار سال کے اندر صوبہ ورنگل کو حُسنِ انتظام کا نمونہ کامل بنا دیا۔

ان کوششوں اور ہمدردیوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ رعایا میں ایک عام گرویدگی پیدا ہو چنانچہ رعایائے شہر کا صدر دروازہ ان کی یادگار کے طور پر بنایا اور اس پر ان کے نام کا ایک بڑا کتبہ نصب کیا۔

ان خدمات کے صلہ میں اعلیٰ حضرت کی پیش گاہ سے ۱۳۰۲ھ میں خانی و بہادری اور انتصار جنگ کا خطاب عطا ہوا۔

(۵)

سنہ ۱۸۸۷ء میں عماد السلطنت کے استعفے کے بعد جب نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کا وزارت پر تقرر ہوا تو اعلیٰ حضرت نے بغیر کسی تحریک کے فرمان خاص کے ذریعہ سے معتمدی

مالگزاری پر سرفراز فرمایا۔ اس معتمدی سے محاصل و انتظام حکومت کے اہم صیغوں کا تعلق تھا۔ نواب صاحب نے اس عہدہ کا جائزہ لیتے ہی اعلیٰ درجہ کی بیدار مغزی اور قابلیت سے اصلاحات کیں اور جو خرابیاں عرصہ سے چلی آتی تھیں آزادانہ اور انصافانہ اصول کے ساتھ ان کو دور کیا۔

جاگیروں اور معافیوں کی تحقیقاتوں اور صوبہ تلنگانہ کے بندوبست میں جو اس صوبہ میں پہلا بندوبست تھا جس طرح راعی کے حقوق کی حفاظت کی اُسی طرح رعایا کے حقوق کی وکالت اور ان کا تحفظ بھی رکھا۔ اُنھوں نے بندوبست کے سلسلہ میں صاف طور پر اس اصول کو واضح کر دیا کہ

"مالگزاری کا انتظام جس کی تمام تر کامیابی صرف رعایا کی مرفہ الحالی پر منحصر ہے ایک خاص قسم کا انتظام ہے اور اس لئے رعایا کے حق میں سرکار کی طرف سے کسی خاص رعایت کی پالیسی ہمیشہ ایک عمدہ سے عمدہ پالیسی سمجھی جاتی ہے۔"

پھر چند سال کے بعد وزیر کے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے وہ حکومت کے ہر جزو کل پر حاوی ہو گئے اور اسی نسبت سے اُن کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔

اُنھوں نے تمام ایسے جابرانہ دستوروں اور نذرانوں کو جو رعایا پر بار تھے یک قلم موقوف کرایا حتّٰی کہ محل شاہی کے باورچی خانہ کے لئے دیہات سے جو بکرے بکریاں ڈیڑھ سو سال سے بطور نذر آتے تھے اور ہر بچوں سے پاؤں کے آنے کا جو دستور مقرر تھا اعلیٰ حضرت سے

بالمشافہ عرض کر کے اُن کو بند کرا دیا۔

لوکل فنڈ اور لوکل بورڈ کے طریقہ کو جاری کیا! ور مقامی جماعتوں کو ان آمدنیوں کے خرچ کا پورا اختیار دیا۔

صنعت و حرفت کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن قائم کئے جانے کی تجویز پیش کی اور مُلکی صنعت و حرفت کی سرپرستی کے لئے دفاتر سرکاری میں مُلکی مصنوعات کے استعمال کی خاص ہدایت کی اور مُلکی مصنوعات کی نمائشوں کی بنیاد ڈالی۔

یونانی شفاخانے اول بلدہ میں اور پھر مفصلات میں قایم کئے گئے اور طبّی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ طبیہ بھی جاری ہوا۔

ملازمت سرکارِ عالی میں مُلکی لوگوں کے حقوق محفوظ کئے اور جو ملازم کہ اصلی وجوہ یا ہیر پھیر کے طریقوں سے تخفیف ہو گئے تھے اُن کی پریشان حالت پر وزارت کو خاص توجہ دلائی۔ جو ناقابل خدمت تھے اُن کو وظیفہ و انعام دیا گیا اور جو کام کرنے اور خدمت کے قابل تھے اُن سب کو قابلیت کے لحاظ سے مقرر کرایا اور جب تک تمام تخفیف یافتہ مقرر نہ ہو گئے کوئی جدید تقرر عمل میں نہ آیا اور تاریخ تخفیف سے تاریخ ملازمت تک ان کو تنخواہیں ملتی رہیں۔ ماتحت ملازموں سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے مدارج مشاہرات اور ترقیوں کے اصول مقرر کئے۔ انھیں کی تجویز سے پردہ نشین خواتین کی قلمبندی بیانات کے لئے ایک زنانہ کمشنر کا تقرر عمل میں آیا۔

مُلکی انتظامات کے علاوہ اُن پولیٹیکل معاملات میں بھی جن کا تعلق امپیریل گورنمنٹ سے تھا

کامل دوراندیشی، تدبر اور آقا کی وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔

ان پولٹیکل کاموں میں نہایت اہم کام اجارۂ معدنیات کی تنسیخ کا تھا جو چند سال قبل رزیڈنسی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے مشورہ سے لندن کے اجارہ داروں کے ساتھ مکمل ہوا تھا۔

اس اجارہ سے گورنمنٹ نظام کے فوائد کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ نواب صاحب نے ایک تنقیح کے سلسلہ میں اس معاہدہ پر غور کیا اور اپنے شکوک و شبہات ظاہر کئے تو نواب محسن الملک نے ان چالاکیوں کا جو لندن میں کی گئی تھیں لندن کے ایک ماہر مالیات کی مدد سے انکشاف کرلیا۔ یہ معاملات اس زور شور کے ساتھ پبلک میں آئے کہ اس کی تحقیقات کے لئے ایک پارلیمنٹری کمیٹی قایم ہوئی اور بالآخر ایک دوسرا صاف و صریح معاہدہ عمل میں آیا جس سے اعلیٰ حضرت کی گورنمنٹ کے حقوق محفوظ ہوگئے اور جو نقصان پہنچا تھا اُس کی بھی ایک حد تک تلافی ہوگئی۔ اس معاملہ کے متعلق نواب صاحب پر بڑی اہم ذمہ داری تھی اور جس قدر وہ اہم تھی اُسی اہمیت کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیا۔ لندن کی کارروائیوں کی نگرانی، پالیسی کا قایم کرنا، پارلیمنٹ کی رپورٹ کے بعد اپنی گورنمنٹ کی طرف سے یادداشت کی تیاری، گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹریوں سے بحث و مباحثہ اور بالآخر اس پیچیدہ مسئلہ کو بغیر کسی اخلاقی و مادی نقصان سلجھا لینا ان کا ایک بردست کارنامہ ہے۔

انھوں نے استرداد برار کا سوال پیش کرنے میں بھی محنت شاقہ کی تھی اور ایک

زبردست اور مبسوط یادداشت بھی تیار کرلی تھی لیکن اس کے باضابطہ پیش ہونے سے پہلے ہی ان کا زمانہ ختم ہوگیا اور اُن کی کوشش اسی حد تک رہ گئی۔

غرض اس دور میں جس قدر اہم پولیٹیکل معاملات انجام پذیر ہوئے ان سب میں نواب صاحب کی قابلیت و سرگرمی بطور جزوِ اعظم شامل رہی۔ اُنھوں نے اپنے تمام دوران ملازمت میں پوری قابلیت کامل مردم شناسی اور انتہائی محنت کے ساتھ اپنی خدمات کو انجام دیا جس کا اثر ہر شخص کے دل پر تھا اور جس کو جتنا زیادہ قریبی واسطہ تھا اسی قدر اس کے دل پر نواب صاحب کے ان اوصاف کی عظمت کا نقش مرتسم تھا۔

نواب مہر فریدون الدولہ فریدون جنگ بہادر کے سی ایس آئی جنھوں نے عرصہ تک ان کے ساتھ کام کیا ہے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"میرے دل میں ان کی بہت بڑی عظمت و وقعت تھی، وہ حق کیش
و صفا ضمیر کے پابند اور نہایت ایمان دار عہدہ دار تھے۔ اُن میں قوتِ عمل اعلیٰ
درجہ کی تھی اور پندرہ سولہ گھنٹہ روزانہ کام کرنے کو کچھ نہیں سمجھتے تھے"

وہ ان عام مشکلات کی وجہ سے جو عموماً انگریزوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنے سے رونما ہوتی ہیں انگریزوں کا کثیر تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر پسند نہیں کرتے تھے لیکن جو عہدہ دار مامور تھے یا مامور کئے جاتے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے مسٹر ڈنلاپ سی آئی ای جو بعد کو معتمد مالگزاری ہوئے عرصہ تک اُن کے ماتحت رہے تھے نواب صاحب کے کریکٹر اور اپنے تعلقات کی نسبت کہتے ہیں کہ

"وہ نہایت جفاکش، اعلیٰ اصول کے بے حد پابند، ایماندار، پبلک کے ہمدرد اور ریاست کے ایک قابل قدر ملازم تھے، ان کے ساتھ میرے تعلقات ۱۸۸۵ء سے شروع ہوئے تھے اور ان کی واپسی کے وقت تک جو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں آئی قایم رہے۔ اگرچہ وہ ہمیشہ انتظامی تجاویز کو میرے نقطۂ خیال سے نہیں دیکھتے تھے لیکن اس اختلاف رائے سے میرے دوستانہ تعلقات میں کبھی فرق نہیں آیا وہ ہر وقت کل تجاویز کے موافق و مخالف دلائل سننے کے لئے تیار رہتے تھے اور معقول دلائل تسلیم کر لیتے تھے۔"

اس دور میں نواب صاحب کا اپنے فرائض کے لحاظ سے رزیڈنسی سے بہت گہرا تعلق تھا اور نواب صاحب جیسی طبیعت مرتبہ اور کیرکٹر کے عہدہ دار کو ایسے مواقع پر جب کہ اغراض و حقوق ملکی میں کوئی تصادم واقع ہو یا امپیریل پالیسی سے کوئی اختلاف کرنا پڑے یا خود رزیڈنٹ پر پارٹی فیلنگ کا کوئی اثر ہو جائے سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور نواب صاحب کو بھی ایسے موقع اور اتفاق پیش آئے لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے فرائض کو آزادی سے انجام دیا اور اپنی حقوق و عذرات کو واقعات و دلائل سے مضبوط کر کے پیش کیا اور ریاست کے اندرونی معاملات میں حتی الامکان رزیڈنسی کی مداخلت کو جو ریجنسی کے زمانہ سے قایم تھی کم کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایک رزیڈنٹ مسٹر ہاول کے ساتھ سخت تصادم بھی واقع ہوا لیکن امپیریل گورنمنٹ کی طرف سے مداخلت دور کرنے میں تائید ہی حاصل ہوئی

اُنھوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے کبھی رزیڈنسی کا سہارا نہیں ڈھونڈا اور اسی قدر واسطہ رکھا جو مفاد ملکی کے لحاظ سے ایک عہدہ دار کے لئے ضروری ہے۔ اُنھوں نے رزیڈنسی کے مرتبہ اور اس کی عظمت و قوت کو بھی ہر موقع پر ملحوظ رکھا اور مختلف فیہ مسائل کے طے کرانے میں ایک صاف اور ایماندارانہ اصول کی پیروی کی۔

اس پالیسی اور طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ خواہ کسی رزیڈنٹ سے کیسا ہی اختلاف رائے ہو لیکن اس کے دل میں نواب صاحب کی عزت اور اعلیٰ کریکٹر کا گہرا نقش قایم ہوتا تھا۔

سر ڈینس فٹز پیٹرک نے جو ایک عرصہ تک حیدرآباد میں رزیڈنٹ رہے تھے اور بعد کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے سر چیچلی پلوڈن کے دکھانے کے بعد سر چارلس کراسویٹ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ کو نواب صاحب کے تعارف میں جو طولانی خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ

"میں مشتاق حسین کے کریکٹر کو جب تک میں حیدرآباد میں رہا ہر طرح قابل تعریف سمجھتا رہا میں نے ان کے بدترین دشمن کو اس کے سوا اور کچھ کہتے نہیں سُنا کہ ان کا دامن برائی سے بالکل پاک ہے اس ملک کے لوگوں میں جن سے مجھے واسطہ پڑا ہے وہ سب سے زیادہ کامل ایماندار اور کارگزار ہیں اور ان کی وہ دانائی جو انھوں نے وزیر اور نظام اور رزیڈنٹ کے تعلقات درست رکھنے میں کی ہے تمام تعریفوں سے مستغنی ہے"

ان کو اکثر و بیشتر مواقع اعلیٰ حضرت کی پیشی میں بالمشافہ کاغذات پیش کرنے کے ملتے تھے اور اعلیٰ حضرت الطاف شاہانہ سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ ان موقعوں پر مخلوق خدا کی فائدہ رسانی کی کوشش کی۔

اعلیٰ حضرت نے نواب صاحب کی ان خدمات جلیلہ کی قدر شناسی میں ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں وقار الدولہ وقار الملک کا خطاب عطا فرمایا۔ اور فتح میدان کے قریب ایک عالی شان مکان بھی مرحمت کیا۔

(۶)

اس اہم اعتماد کے لحاظ سے جو نواب سر آسمان جاہ کو اُن پر تھا ان کے حاسدوں نے جن میں بعض بڑے عہدہ دار بھی شامل تھے مختلف طریقوں سے ان کے متعلق خراب شہرتیں پھیلانے کا ایک منتظم سلسلہ قائم کیا لیکن نواب صاحب نے ہمیشہ ان شرارتوں اور رکیک حملوں کو حقارت سے دیکھا اور نظر انداز کیا۔ اور انھیں اسباب کی بنا پر اُنھوں نے جنوری ۱۸۹۱ء میں پنشن کی درخواست پیش کر کے اس کی منظوری پر اصرار کیا تھا۔ لیکن نواب سر آسمان جاہ نے اس وقت نہ مانا۔ اب جس طرح بعض رسوخ یافتہ خود غرض اشخاص در پردہ کام کر رہے تھے جن کو سر چلی پلوڈن کی بھی پشت پناہی حاصل تھی ان کا مقابلہ بغیر اس کے ناممکن تھا کہ نواب صاحب بھی اپنے گرد و پیش پارٹیاں بنائیں اور جو وقت کہ خدمت ملک میں گزرنا چاہئے اس کو مقابلہ و مدافعہ میں گزاریں جو ان کی ہمت ضمیر اور اخلاق و ایمان کے خلاف تھا۔

کچھ لوگ جن کو اعلیٰ حضرت کی پیشی میں حاضر رہنے کا زیادہ اتفاق رہتا تھا نامعلوم طریقہ پر ایسے الزامات منسوب کرتے رہتے تھے کہ جس سے خاطر اقدس برگشتہ ہو جائے اور دوسروں کے قصوروں اور غلط کارروائیوں اور خراب مشوروں کو اُن کے ذمہ عاید کر کے بدخواہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

ایک موقع پر اعلیٰ حضرت کے ایک جملہ سے جو اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر ادا ہوا تھا اپنی نسبت ناراضی کا اشارہ تصور کیا اور فوراً وظیفہ کی درخواست پیش کر دی اور اُس کو نواب سر آسمان جاہ سے اصرار کے ساتھ منظوری کے لئے اعلیٰ حضرت کی پیشی میں بھجوایا۔ اعلیحضرت نے بہت دن تک اس پر کوئی حکم صادر نہیں کیا لیکن ادھر نواب صاحب کا اصرار تھا اور ادھر اس موقع پر حاسدوں اور دشمنوں کی تدبیروں سے بالآخر حکم منظوری صادر ہوا اور سات سو روپیہ جس میں سو روپیہ حق سے زائد تھے مرحمت ہوا۔

۱۸۶۰ء میں نواب صاحب کے ماموں اور خسر ڈپٹی امام الدین صاحب مرادآباد میں سرسید کے ساتھ انتظام قحط میں شریک تھے اور ان دونوں میں دوستانہ تعلقات تھے۔ سرسید کے خیالات سے ان کو پوری ہمدردی تھی اور اسی وجہ سے وہ سینٹفک سوسائٹی کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔

نواب صاحب بھی اس زمانہ میں وہیں مقیم تھے اور اکثر سرسید کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے فیضِ صحبت سے استفادہ کرتے اور اس طرح گویا ان تعلقات کی بنیاد پڑی جن پر نواب صاحب کی قومی خدمات کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔

نواب صاحب جب علیگڑھ تبدیل ہو کر آئے تو سرسید کے قومی کاموں میں بطور ایک

خادم کے شریک ہوئے دل میں ہمدردی کا جو کامل ولولہ اور صادق جذبہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اب وہ ظاہر ہونے لگا ہر ایک کام جو سرسید اُن کے تفویض کرتے نہایت محنت اور دلچسپی سے انجام دیتے سوسائٹی اور پریس تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا انتظام اُن کے ذمہ تھا جنوری ۱۸۷۶ء میں وہ سینٹفک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر آٹھ سال بعد معاون کا رتبہ حاصل ہوا ۱۸۸۶ء میں اُن کی تعلیمی سرگرمیوں نے ایک رسالہ موسوم بہ "مفید خلائق" کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۹۶ء میں وہ لوکل سررشتہ تعلیم کے ممبر ہوئے وہ ضلع کے مدارس کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرتے اور طلبار کا بذات خاص امتحان لیتے۔ انھوں نے اصلاح حالات کے لئے ایسی زبردست یادداشتیں تحریر کیں کہ سررشتہ تعلیم میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی

تہذیب الاخلاق کے سرگرم مضمون نگار بھی تھے اور ان کا رجحان زیادہ تر اصلاح تمدن کی جانب تھا اگرچہ وہ ایک متشدد مسلمان تھے اور مذہب کے متعلق سرسید کی صحبت اور خیالات سے انھوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا تاہم جو غلاف حقیقی اور اصلی مذہب پر ڈال دیا گیا تھا اُس کے آثار پھینکنے کی کوشش میں وہ ضرور شریک تھے اور جسارت کے ساتھ اظہار خیالات کرتے رہتے تھے۔ اُن کے دل میں قومی لگن تھی اور وہ قومی ہمدردی کے جذبات سے معمور تھا لیکن نجات اُخروی کے لئے وہ اعمال و احکام مذہب کی پابندی بھی ضروری تصور کرتے تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں ان خیالات کو نہایت لطیف پیرایہ میں ظاہر کرتے تھے۔ باایں ہمہ وہ سرسید اور نواب محسن الملک کے ساتھ الحاد و زندقہ کے الزاموں اور تہمتوں سے نہ بچے۔

۱۸۷۱ء میں سرسید نے جب کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی جانب سے ایک جوابی مضمون کا اشتہار شائع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ان وجوہ کو معلوم کیا جائے کہ مسلمان سرکاری مدارس میں

کیوں داخل نہیں ہوتے، ان میں علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں نہیں پھیلتی اور علوم قدیمہ کی تعلیم
کیوں گھٹ گئی ہی تو نواب صاحب نے بھی (۹) دن کے اندر ایک مبسوط رسالہ لکھا جس میں
انھوں نے سوال کے ہر جزیہ پر نہایت مدلل بحثیں کیں۔ ان بحثوں میں صرف زور انشا ہی نہیں
ہی بلکہ بنیادی و حقیقی امور کو تاریخ و واقعات اور ذاتی تجربات سے بیان کیا ہی۔ انھوں نے پہلے
حصہ میں جو گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی کمی کے متعلق ہی اس بات سے
قطعی انکار کیا کہ مذہبی تعصب سدّ راہ ہی بلکہ اس کی وجہ یہ قرار دی کہ ان مدرسوں اور
کالجوں میں طلبا کا اخلاق درست نہیں ہوتا۔ انھوں نے کورس کی تاریخی کتابوں پر بھی
نظر ڈالی ہی جس کے مضامین سے مسلمانوں کی مذہبی توہین ہوتی ہی۔ حلقہ بندی اور تحصیلی
مدرسوں میں اردو کی تعلیم کی کمی، افسران تعلیم کا مسلمانوں کی ضروریات سے تغافل، بغض دل آزار
اور ہندو مسلمانوں میں دشمنی کے جذبات پیدا کرنے والی کتابوں کا داخل نصاب ہونا
اور نفس تعلیم کی عدم نگرانی پر بسیط بحث ہی۔ تیسرے حصہ میں کہ علوم قدیمہ کی تعلیم کیوں گھٹ گئی
عرب کی علمی تاریخ اور مسلمانوں کے علمی کارناموں اور یورپ کی تعلیمی حالت کا تذکرہ کر کے
موجودہ زمانہ کی تعلیم کے نقائص سے بحث کی ہی اور اس تعلیمی تنزل کے تمام اسباب و علل
کو بیان کیا ہی۔ چوتھے حصہ میں تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت کو دکھایا ہی اور ۳۲ جواب
مضمون لکھنے والوں میں سے صرف نواب صاحب نے ہی اس مسئلہ پر کما حقہ توجہ کی ہی۔

یہ رسائل جب کمیٹی میں پیش ہوئے تو کمیٹی نے اس رسالہ پر درجہ دوم کا انعام تجویز کیا۔

اسی زمانہ میں انھوں نے سینٹفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید کے لحاظ سے

منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد کی اعانت سے فرنچ ریوولیشن اینڈ نپولین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جس کا نام سرگزشت نپولین بوناپارٹ رکھا ان کے دونوں رفیق عبارت پڑھ کر نواب صاحب کو ترجمہ سمجھاتے اور پھر یہ اس کو اردو کی شستہ عبارت میں لکھتے اور وہ دونوں اس پر نظر ثانی کرتے۔ اس طرح چند مہینوں کی گرم راتوں کی محنت میں اُنھوں نے اس ترجمہ کی تکمیل کی اور سررشتہ تعلیم سے ان تینوں کو انعام ملا۔

یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں منشی نولکشور نے اپنے مطبع میں طبع کر کے لکھنؤ سے شائع کی۔

۱۸۷۲ء میں جب محمدن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی قایم ہوئی اور جا بجا سب کمیٹیاں بنائی گئیں تو نواب صاحب نے علی گڈھ کمیٹی میں وصولی چندہ کے متعلق بڑی سرگرمی کے ساتھ کام کیا۔

کمیٹی کے دفتر کی نگرانی اور خصوصاً بجٹ کی تیاری بھی ان کے سپرد تھی۔ غرض ۱۸۷۵ء کی ابتدا تک جو اُن کے حیدر آباد جانے کا زمانہ ہی سرکاری فرائض ادا کرنے کے بعد جو وقت ملتا وہ ان تعلیمی کوششوں میں صرف کرتے رہتے۔ ان کے قیام علی گڈھ سے سرسید کو خاص کر انتظامی معاملات میں بڑا اطمینان تھا۔ نواب صاحب نے خود ایک موقع پر فخر کے ساتھ بیان کیا ہی کہ میں نے برسوں قومی کاموں کو بطور ایک ماتحت کے سرسید کے زیر ہدایت انجام دیا ہی۔

ان جسمانی و دماغی خدمتوں کے علاوہ نواب صاحب بقدر حیثیت مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے اور اس وقت کا پانچ پانچ اور دس دس روپیہ کا چندہ آج کل کے سینکڑوں

اور ہزاروں کی رقم پر بھاری تھا۔

سر سید کے مشن کے علاوہ مقامی ہمدردیوں کے کاموں میں بھی برابر حصہ لیتے تھے۔
مینوسپل فرائض کو ادا کرنے میں نہایت سرگرم تھے ۱۸۶۹ء میں انھوں نے ایک
یونانی شفاخانہ اور باقاعدہ دواخانہ پرائیویٹ چندوں سے قایم کرایا۔

(۷)

حیدرآباد جانے کے بعد اگرچہ وہاں کے کاموں میں سخت مشغولیت تھی لیکن جس
عمارت کی بنیاد بھرنے میں اُنھوں نے دس سال تک کام کیا تھا یہاں بھی اُس کے تعمیری
کاموں میں برابر شریک رہے۔ اور جب وسط ۱۸۷۹ء میں وہ چند دنوں کے لئے عارضی
طور پر حیدرآباد سے جدا ہوئے تو اُنھوں نے علی گڈھ میں قیام کیا اور چونکہ وہ متعدد کمیٹیوں
کے ممبر تھے ہر کمیٹی میں محنت وانہماک کے ساتھ کام کرتے رہے۔ بورڈنگ ہاؤس کا انتظام
اور طلباء کی تربیتِ اخلاق کی نگرانی خاص طور پر ان کے سپرد کی گئی جس کے لئے اُنھوں نے
بورڈنگ ہاوس میں سکونت اختیار کی۔

بورڈروں کے ساتھ اُن کی شفقت ومحبت، ان کے آرام وراحت کا لحاظ اور
ان کی اخلاقی تربیت و اصلاح کے طریقے اس زمانہ کے طلباء میں ابھی تک زبان زد ہیں اور بطور
روایت کے بیان کئے جاتے ہیں۔

وہ زجر وسرزنش کو سزا کا آخری درجہ سمجھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصوروں سے

بظاہر چشم پوشی کرجاتے لیکن کسی نہ کسی موقع پر قصوروار کو اُس کے قصور سے اس طرح آگاہ کرتے کہ وہ خود اپنے ضمیر سے تنبیہ حاصل کرلیتا۔ اکثر و بیشتر قصوروں کے موقعہ پر طلبا کے جذبات غیرت اور حمیت نفس کو اس طرح متحرک کر دیتے کہ وہ آئندہ کے لئے تائب و محترز ہو جاتے۔ راتوں کو نگرانی بہت سخت تھی اور اُنھوں نے وقت پر سونے اور وقت پر جاگنے کا عادی بنانے میں زیادہ توجہ کی تاکہ راتوں کے اطمینان میں طلباء لہو و لعب میں وقت گزار کر اپنی صحت خراب نہ کرلیں۔

طلباء کے ساتھ اُن کی شفقت بالکل ایسی ہی تھی جیسی اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ ان کی تکالیف سے سخت متاثر ہو جاتے تھے ۱۸۸۲ء میں جب تعلیمی کمیشن کے سامنے اُنھوں نے اپنی شہادت پیش کی ہے تو عام تعلیمی مسائل پر بحث کرتے ہوئے امتحان کی سختیوں کے ساتھ زمانہ امتحان پر جو موسم بارش گزرتے ہی شروع ہو جاتا تھا کمیشن کو توجہ دلائی اور بارش کی اُمس میں طلباء جس طرح امتحان کے لئے تیاری میں تکالیف برداشت کرتے تھے اس کو نہایت موثر طور پر بیان کیا۔

اخلاقِ اسلامی اور اعمالِ مذہب کی پابندی کے متعلق البتہ تشدد کو جائز رکھتے تھے لیکن اس کی شاذ ہی نوبت پہنچتی تھی قصوروں پر سزائے بدنی کے متعلق ان کے اور سرسید کے مابین سخت اختلاف تھا اور جب تک نواب صاحب انچارج رہے ہیں انھوں نے اس طریقہ کو جاری نہیں ہونے دیا۔ وہ سزا سے زیادہ ملامت کو موثر سمجھتے تھے وقتاً فوقتاً حسب موقع و ضرورت طلباء کے سامنے تقریریں بھی کرتے تھے جس کا زیادہ تر موضوع

تربیت اخلاق اور پابندی احکام مذہب ہوتا ۔ بورڈنگ ہاؤس کے متعلق جب کوئی متعصب معترض کوئی غلط فہمی پھیلانے والا مضمون اخباروں میں لکھتا تو نواب صاحب اس کے جواب بھی شائع کرتے رہتے تھے ۔ غرض جب تک وہ حیدرآباد واپس نہیں گئے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کاموں میں مصروف رہے ۔

اسی دوران میں حاجی اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی نے سرسیّد کے احسانات کے اعتراف میں ان کی یادگار قایم کرنے کی تحریک پیش کی نواب صاحب نے نہایت دل چسپی اور شغف کے ساتھ اس کی تائید کی اپیلیں شائع کیں اور جو کمیٹی فراہمی چندہ کے لئے قائم ہوئی اس میں سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا اور ایک معقول رقم فراہم کرلی ۔

اب حیدرآباد میں اگرچہ اُن کے فرائض بہت اہم اور نازک تھے جہاں فرصت کا نام تک نہ تھا لیکن وہ اپنے قومی کالج اور قومی تعلیم کے خیال سے ایک لحظہ کو بھی غافل نہیں رہے اور امکانی کوششوں میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا ۔

۱۸۸۹ء میں سرسیّد نے مسٹر اسٹریچی بیرسٹرایٹ لا اور سید محمود کے مشورہ سے قواعد و قوانین تیار کرائے اور ساتھ ہی اس خیال سے کہ یہ کالج جس مقصد اور پالیسی سے قایم کیا گیا ہے سید محمود اس کے متعلق تمام صلاح و مشورہ میں شریک غالب رہے ہیں ان کو اپنے بعد اس کا سکریٹری مقرر کرانا چاہا لیکن اس طرح آئندہ کے لئے سکریٹری کے تقرر کو تقریباً سب ہی نے ناپسند کیا اور شدید ترین اختلاف پیدا ہوگیا ۔ مولوی سمیع اللہ خاں سی ایم جی نے جو کالج کی بنا میں سرسید کے برابر کے ساتھی تھے سخت ترین مخالفت کی ۔

نواب صاحب بھی سرسید کی اس کارروائی سے متفق نہ تھے انھوں نے خانگی خطوط کے ذریعہ سے سمجھایا اور خود رخصت لے کر آنے اور اصلاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن معاملہ نے اس قدر طوالت اختیار کر لی تھی کہ سرسید نے صاف طور پر لکھ دیا کہ "اب یہ معاملہ حد سے گزر گیا ہی کہ اس میں کچھ ترمیم ہو سکے۔" اس معاملہ میں سرسید نے اپنی رائے پر استقامت اور ضد کی حد کر دی اور یہاں تک دھمکی دی کہ اگر رائے دینے والے اس سے اتفاق نہ کرینگے تو وہ صرف سکرٹری کے عہدہ سے ہی استعفا نہ دیدیں گے بلکہ جو مدرسہ کے متعلق اس وقت تک ہوا ہی اس کو ملیامیٹ کر کے رکھ دینگے۔

اُنھوں نے نواب صاحب کو مرعوب و متاثر کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا لیکن نواب صاحب نہ تو سرسید کی عظمت و احترام سے مرعوب ہوئے اور نہ ان کے احسانات و عنایات اور محبت سے متاثر ہوئے اور اس انتخاب سے زبردست اختلاف کیا۔ اپنے انتخاب کے وجوہ انھوں نے لکھے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ

"میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہی اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہی۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہی کہ اُس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے۔ انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو اُن سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن قوم اور مُلک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ

بخشوانا پڑے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآنہیں ہوسکتا"۔

سرسید کو نواب صاحب کے اختلاف سے بہت صدمہ ہوا اور وہ ایک حد تک کشیدہ ہو گئے لیکن نواب صاحب کے دل میں سرسید کی وہی عظمت و محبت قایم رہی اور جب کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کے رفقا نے کالج سے اپنا قطع تعلق کرلیا تھا نواب صاحب بدستور اس کے معین و مددگار رہے اور اکثریت کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس موقع پر حاجی اسمٰعیل خاں صاحب نے سید محمود کی یادگار کی جو تجویز پیش کی اگرچہ اس میں پارٹی اسپرٹ تھی اور تجویز یادگار کی تحریر کو ایک قسم کا فتح نامہ بنایا تھا جس پر نواب صاحب نے افسوس و اعتراض بھی کیا لیکن چونکہ تجویز بنفسہ مفید تھی اس میں نہایت کشادہ دلی کے ساتھ چندہ دیا۔ علاوہ برایں کالج کی دیگر ضروریات کے لئے نواب سر آسمان جاہ سے امداد دلوائی اور آسمان منزل کی عمارت کے سلسلہ تعمیر میں گراں قدر رقوم چندہ میں وصول کرائیں۔

۱۸۹۰ء میں جب سر راجہ امیر حسن خاں تعلقہ دار محمود آباد (اودھ) نے اپنا سالانہ چندہ بند کر لیا تو چند دوستوں کے ساتھ اس نقصان کو پورا کرنے میں کوشش کی۔

۱۸۹۱ء میں جب کالج کی ترقی کے لحاظ سے لا کلاس کا قایم ہونا نہایت ضروری تھا اور سرسید اخراجات کی طرف سے بہت پریشان تھے اُنھوں نے نواب صاحب کو اپنی پریشانیاں لکھیں اور خواہش کی کہ گورنمنٹ نظام کی امداد دگنی ہو جائے اور نظام میوزیم کی تعمیر کے لئے معقول رقم فراہم ہو جائے تو یہ سب پریشانیاں دور ہوں۔ نواب صاحب نے فوراً کوشش شروع کی کہ سرسید ایک ڈپوٹیشن لے کر آئیں اور اعلیٰ حضرت ایڈریس قبول فرمائیں اور اس طرح

کالج کی مالی مشکلات حل ہو جائیں۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ سرسید کو اطلاع دی گئی اور ستمبر ۱۸۹۱ء میں سرسید ایک ڈپوٹیشن لے کر حیدرآباد گئے۔ اعلیٰ حضرت نے ۱۰ ستمبر کو ایڈریس قبول فرمایا اور اس کا حوصلہ افزا جواب دیا اور ۱۲ ستمبر کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ اضافہ کا حکم سرسید کے ہاتھوں میں پہونچ گیا۔

اس شاہانہ امداد کے علاوہ ۲۴ ہزار پانچسو روپئے ایک دن کے چند گھنٹوں میں جب کہ یہ پارٹی اسپیشل ٹرین کے ذریعہ سے نواب صاحب کے ساتھ ورنگل گئی تھی عمائد ورنگل نے نظام میوزیم کی تعمیر کے لئے پیش کیا۔

ڈپوٹیشن کو جو غیر متوقع کامیابی ہوئی اس نے سرسید کے دل پر ایک خاص اثر کیا چنانچہ ۲۷ ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں کہ :-

"حیدرآباد میں جو کچھ ہوا وہ صرف آپ کی عنایت، آپ کی کوشش، آپ کی سعی، آپ کی توجہ، مختصراً یہ کہ آپ کی ذات سے ہوا۔ اس کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔"

نواب صاحب نے ابتدا سے علاوہ دماغی و جسمانی امدادوں کے اپنی استطاعت کے تناسب سے ہمیشہ فیاضی کے ساتھ مالی امدادیں بھی کیں۔ چاہ اخوان الصفا۔ سٹڈنس یونین کلب

یادگار سید ظہور حسین، محمود منزل، تعمیر عام، خام بورڈنگ ہاؤس، پختہ بورڈنگ ہاؤس، سالار منزل، اورنٹیل اسکول کلاسز، دیوار احاطہ کالج، اسٹریچی ہال، نظام میوزیم، آسمان منزل میں سینکڑوں سے ہزاروں تک کی رقمیں دیں۔ لاکلاس میں ماہانہ چندہ دیا ۱۸۹۱و۹۲ء کے بجٹ میں جو کمی آئی اس کے پورا کرنے میں حصہ لیا۔ دینیات کے وظائف وانعامات خاص کی تحریک کی اور پہلا چندہ تین سو روپیہ کا اپنے پاس سے دیا۔ انٹرمیڈیٹ میں فیل شدہ طلبا، جو بوجہ عدم استطاعت فیس ادا کر کے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے تھے ان کی امداد کے لئے فنڈ کھلوایا اور پانچسو روپئے کے قریب اپنی امداد دی۔

سرسید جب حیدرآباد گئے ہیں تو بتقریب دورہ ایک ہزار اور معاوضہ دعوت میں پانچسو روپئے پیش کئے۔

سرسید بعض اوقات ان کی طرف سے کسی فنڈ میں خود رقم چندہ معین کر کے یا کسی طالب علم کا وظیفہ مقرر کر کے صرف اطلاع دے دیا کرتے تھے اور وہ رقوم ادا ہوتی رہتی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ دوسروں پر چندہ قایم کر کے ان کی تحویل میں رکھا یا جاتا اور ان کا فرض تھا کہ خود ادا کریں یا جس کا چندہ ہے اس سے وصول کرائیں۔

نواب صاحب کا معمول تھا کہ جب ان کا اضافہ ہوتا تو ایک ماہ کا اضافہ وہ ہمیشہ کالج کے نذر کیا کرتے تھے اور اس پر ابتدا سے آخر تک قایم رہے۔

۱۸۹۰ء میں سرسید نے محمد بن سعد کاتب الواقدی کی تاریخ کے ایک باب کا ترجمہ کرایا تھا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ ہائے اقدس ہیں اور ان وفود کا

حال ہی جو آں حضرت صلعم کے حضور میں قوموں کی طرف سے آئے نواب صاحب نے اس کو طلباء کے فائدہ کے لئے اپنے صرف سے طبع کرا کے کالج کو ہدیہ دے دیا۔

کالج کے علاوہ بھی سرسید بعض غریبوں کی ذاتی امداد کے لئے سفارش کیا کرتے تھے اور نواب صاحب ہمیشہ اس کو خوشی کے ساتھ منظور کرتے تھے۔

نواب صاحب نے جو بیش قرار امدادیں کی تھیں اُن سے سرسید نے متاثر ہو کر ۲۹ نومبر ۱۸۹۰ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک خاص مضمون بہ عنوان " فیاضی نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین " سپرد قلم کیا تھا۔

پھر ۱۸۹۱ء میں نواب صاحب کی قومی ہمدردی کے بیش بہا خدمات کے شکریہ میں ان کی یادگار کی تحریک کرتے ہوئے کہا کہ:-

" نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے بہ لحاظ قومی ہمدردی کے جو بیش بہا خدمات کالج کی کی ہیں وہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہیں انہوں نے اپنی جیب خاص سے متعدد مرتبہ زر کثیر بطور مسکریشن کے کالج کو عطا کیا ہے۔ ان کے خاص عطا کئے ہوئے روپیہ سے ایک پختہ بورڈنگ ہاؤس کالج کی عمارتوں میں بنایا گیا ہے۔ اسکول کا بڑا ہال اور مسجد مدرسۃ العلوم جس قدر کہ اب تک تیار ہوئی ہے جو نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ کی بے نظیر فیاضی کی یادگار ہے اس میں بھی اور نیز آسمان منزل کے چندہ فراہم ہونے میں مولوی محمد مشتاق حسین صاحب کی سعی دکوشش کا بہت بڑا حصہ ہے۔"

حال میں جو ڈپوٹیشن حیدرآباد میں گیا اس کے تمام اغراض و مطالب کو مولوی محمد مشتاق حسین نے بہ احسن وجوہ بحضور عالی ہز ہائینس نظام اور ہز اکسلنسی سر آسمان جاہ مدار المہام کی خدمت میں پہنچایا جس کا نتیجہ ایسی فیاضی کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی نظیر مسلمانوں کی فلاح و بہتری کے کاموں میں نہیں پائی جاتی۔

علاوہ اس کے ان کی ذاتی جسمانی محنت جو انھوں نے مدرستہ العلوم میں کی کسی طرح فراموش ہونے کے قابل نہیں ہے... پس ان کے یہ تمام احسانات اس قابل ہیں کہ ان کی ایک مستقل یادگار مدرستہ العلوم میں قایم کی جائے۔

اس کے بعد سر سید نے عمارات کا تذکرہ کر کے کہا کہ

"پس میں تحریک کرتا ہوں کہ بہ یادگار احسانات مولوی محمد مشتاق حسین یہ عمارت ان کے نام سے موسوم ہو اور مشتاق منزل کہلائے۔"

(۸)

حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد انھوں نے اپنے وطن امروہہ میں قیام کیا اور باوجود خانگی تردد و مصائب اور قابل و جوان فرزند و بیوی اور کئی اعزا کی موت کے انھوں نے قومی کاموں کی طرف سے غفلت نہیں کی۔

اس زمانہ میں کالج کے انتظامی حالات بہت کچھ اصلاح کے محتاج تھے اور یہ موقع تھا کہ سر سید کے دونوں رفیق نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اصلاح کرتے انھوں نے

کوششیں شروع کیں لیکن سرسید پر بعض لوگوں نے ایسا اثر قایم کر لیا تھا کہ وہ ہر خیر انھیں کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ نواب وقار الملک نے نظام کالج کی اس ابتری پر توجہ دلائی لیکن کوئی اثر نہ ہوا اور چونکہ کالج ایک قومی امانت تھی اس لئے نواب صاحب کو باوجود اس محبت و شکر گزاری اور ادب و احترام کے جو سرسید کی نسبت ان کے دل میں تھا کسی قدر تیز روش اختیار کرنی پڑی اور تحریروں میں گرمی بھی آگئی۔

جنوری ۱۸۹۶ء میں سرسید نے اپنے قانونی اختیار کی تاویل سے اکیس[21] جدید ٹرسٹی منتخب کر کے موجودہ ٹرسٹیوں کو صرف اطلاع دے دی اس طرح بہت بڑی مجارٹی حاصل کر لی نواب صاحب نے پہلے پرائیویٹ تحریر میں اس کارروائی پر اعتراض کیا لیکن سرسید نے جواب میں صاف لکھ دیا کہ

"جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لئے مبارک فال نہیں ہیں ہم انھیں امور کو قومی کالج کے لئے مبارک فال سمجھتے ہیں پس اس کا کوئی علاج نہیں ہے اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ خدا کو جو منظور ہے وہ ہوگا۔"

آخر نواب صاحب نے مجبور ہو کر بجٹ میٹنگ میں اس کارروائی پر اعتراض کیا تو سرسید کے غضب آلود جواب کی بنیاد پر مرزا عابد علی بیگ کی تحریک اور مولوی نذیر احمد کی تائید سے نواب صاحب کے متعلق "ملامت کا ووٹ" پاس کیا گیا۔ مگر نواب صاحب نے اس ملامت کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور ٹرسٹی شپ کے فرائض اور ذمہ داری کو صداقت و مضبوطی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

سرسید کے انتقال کے بعد کالج پر بہت نازک وقت آگیا نواب صاحب ان مواقع پر متعدد مرتبہ علی گڈھ گئے اور اصلاح حالات کی جو کوششیں ان سے ممکن تھیں کرتے رہے۔ سرسید میموریل فنڈ کی کامیابی کے لئے بھی سعی کی اور خود بھی ایک معقول رقم پیش کی اس موقع پر جب کہ سید محمود کے عزل کا سوال ہر طرف سے پیش تھا تو انھوں نے ۱۸۸۹ء کے فیصلہ کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے درخواست کی کہ ایک موقع اصلاح حالات کا اور دیا جائے۔ یہ رائے تسلیم کی گئی اور نواب صاحب مامور کئے گئے کہ سید محمود سے گفتگو کریں، چنانچہ انھوں نے گفتگو کی مگر کوئی تشفی نہوئی اور حسرت و افسوس سے ان کے معزول کئے جانے سے اتفاق کیا۔

نواب صاحب کی سب سے بڑی اور اصولی کوشش یہ تھی کہ قانون و قواعد میں ضروری ترمیمات و اصلاحات ہو جائیں۔ چنانچہ ایک کمیٹی قایم ہوئی نواب صاحب اس کے سکرٹری منتخب ہوئے انھوں نے اسی غرض کے لئے سید محمود کے پاس علی گڈھ اور سیتاپور میں قیام کرکے مسودہ تیار کیا اور ٹرسٹیوں سے رائیں طلب کیں لیکن ممبروں کی عدم دلچسپی اور کام کی سستیِ رفتار کے باعث وہ مستعفی ہو گئے۔

نواب محسن الملک نے اپنی تمام قوتوں کو کالج کی مالی حالت کے استحکام اور اس کی وسعت و شہرت کی طرف مبذول کر دیا تھا اگرچہ ان دونوں کی پالیسیوں میں اختلاف تھا لیکن نواب صاحب اپنے رفیق کی ہر نازک موقع پر اعانت و حمایت کرتے رہے۔ سر انٹونی میکڈانل کے زمانہ میں جب اردو ہندی کے جھگڑے میں نواب محسن الملک کی آزادرائے

روک کی گئی اور انھوں نے استعفا پیش کیا تو نواب صاحب نے استعفے کی واپسی پر بے انتہا اصرار کیا۔ ہز آنر سر جیمس لاٹوش سے پرائیویٹ ملاقات کر کے نواب محسن الملک کے سکریٹری رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ نواب محسن الملک کے زمانہ میں اگرچہ کالج کی مالی حالت ترقی پزیر تھی۔ اس کا دائرۂ اثر بڑھ رہا تھا لیکن اندرونی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی اسٹاف اور طلباء کے تعلقات روز بروز زیادہ خراب ہوتے جاتے تھے۔ (ڈائریل سر) ماریسن صاحب جانے والے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مسٹر کارنا پرنسپل مقرر کئے جائیں اور نواب محسن الملک بادلِ ناخواستہ ان سے متفق تھے چونکہ مسٹر کارنا میں اُن اوصاف کا فقدان تھا جو اس قومی کالج کے پرنسپل کے لئے ضروری ہیں اس لئے باخبر حلقوں میں انتخاب کو اندیشناک تصور کیا جاتا تھا تو نواب صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ نواب محسن الملک کے ساتھ حتی الامکان کسی شدید اختلاف سے احتراز کرتے تھے لیکن اس موقع پر اُن کو سخت اختلاف کرنا پڑا اور پوری قوت کے ساتھ مسٹر کارنا کے انتخاب کی تجویز کو مسترد کرا دیا بعض دور اندیش اصحاب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ نواب صاحب اپنی سکونت علی گڑھ میں اختیار کر کے کالج کے اندرونی نظم و نسق کی نگرانی کریں نواب محسن الملک کا بھی یہی اصرار تھا لیکن جب وہ راضی ہو گئے اور کل انتظام بھی کر لیا تو بعض نامعلوم وجوہ سے نواب محسن الملک نے ہی اس کو مناسب تصور نہیں کیا اور کل انتظامات منسوخ کر دیئے گئے۔ اسٹرائک کے نازک زمانہ میں جو اندرونی خرابیوں کا لازمی نتیجہ تھی نواب صاحب بھی شورش طلباء کے تحقیقاتی کمیشن میں ممبر تھے اور

آزادی کے ساتھ بیان کیا۔

(۹)

انھوں نے کالج کے علاوہ اور قومی کاموں میں بھی اپنا وقت صرف کیا۔ زیادہ وقت مسلمانوں میں سیاسی تحریک پیدا کرنے میں گزارا۔ وہ کانفرنس کے اجلاسوں میں بھی اکثر شریک ہوئے اور ہمیشہ مفید بحثوں میں حصہ لیا۔

انھوں نے سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم کے اجرا کی بھی کوشش کی۔ اس کے متعلق بڑی بڑی یادداشتیں لکھیں۔ لفٹنٹ گورنر اور افسران سررشتہ تعلیم سے ملاقاتیں کیں اور بالآخر ایک اسکیم پیش کر کے اس کو منظور کرایا جس کی رو سے صوبہ متحدہ کے مدارس میں مقامی مسلمانوں کو اختیار دیا گیا کہ اسکولوں میں معمولی خواندگی شروع ہونے سے پہلے وہ ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں۔ امروہہ کے مڈل اسکول کو ہائی اسکول بنانے میں کوشش کی اور تعلیم مذہبی کا خرچ اپنے ذمہ رکھا اور چونکہ قصبہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہی اس لئے یہ بھی طے کرایا کہ ہیڈ ماسٹر ہمیشہ مسلمان ہو۔ وہاں کے عربی مدرسہ کو تقویت دی ٹیلیگراف آفس جاری کرایا اور جب تک کہ وہ خود اپنا خرچ ادا نہ کر سکے خود اخراجات ادا کرتے رہے۔

جس وقت مراد آباد اور دہلی کے مابین ریلوے کا اجرا ہونے والا تھا تو امروہہ اس کے لائن سے علحدہ ہو گیا تھا نواب صاحب نے ریلوے کی مجوزہ لائن سے اختلاف کر

لائن کا رُخ بدلوایا اور اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ لائن میں اس ترمیم سے زیادہ نفع ہوگا۔

انھوں نے گورنمنٹ میں ایک اہم تجویز دیہات میں طبّی امداد کے متعلق بھیجی جس میں دیہاتی رعایا کی وہ تکلیفات جو طبّی امداد میسّر نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں دکھائی تھیں۔ گورنمنٹ نے اسکیم پر غور کیا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اس کو منظور کرنے سے انکار کیا۔

اسی طرح دیہاتی تعلیم پر بھی ایک پُرزور یادداشت لکھی اور دیہاتی مدارس کے نصاب میں مفید تغیرات کا مشورہ دیا۔

بمبئی کی پراونشل کانفرنس کی جماعت عاملہ نے جب ان کو نہایت اصرار سے اجلاس منعقدہ احمد آباد کا صدر منتخب کیا تو نواب صاحب نے پہلے اس صوبہ کے خاص خاص مقامات کا دورہ کر کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا خود مشاہدہ کیا پھر اس کے لئے خطبۂ صدارت تیار کیا جو اٹھتیس سال کے ذاتی تجربات پر مبنی تھا اور جس میں قوم کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے قابل العمل اور سہل الحصول مشورے تھے۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں فریضۂ حج بھی ادا کیا اور روضۂ نبوی صلعم کی سعادتِ زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ بمبئی میں جدہ کو روانگی کے وقت بپھارہ خانہ میں جانے اور پھر وہاں سے ساحل تک پیدل راستہ طے کرنے، کشتی میں بیٹھ کر جہاز پر سوار ہونے میں جو سخت تکالیف ہوتی ہیں اُن کا اندازہ صرف حج کو جانے والے ہی کر سکتے ہیں۔ مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج نے ہر چند چاہا کہ نواب صاحب کے لئے خاص انتظام کریں لیکن اُنھوں نے امتیازی انتظام سے معذرت کی اور کہا کہ "میں عام مسلمانوں سے کوئی ممتاز حیثیت اختیار نہیں

کرنا چاہتا۔"

جب حج سے فارغ ہوکر براہ ینبوع مدینہ طیبہ جا رہے تھے تو ہر منزل میں قافلہ کے غربا، ومحتاجین کے لئے لکڑی اور پانی کا انتظام اپنے صرفہ سے کراتے تھے۔

ینبوع سے دوسری منزل میں دو ضعیفہ عورتیں پاپیادہ تکلیف کے ساتھ راستہ چلتی نظر آئیں، بے اختیار اونٹ سے اتر پڑے اور ان دونوں کو بٹھادیا اور خود پیادہ ہو گئے، مولوی مظہر علیم صاحب مرحوم سابق سفیر کانفرنس ہم سفر تھے انھوں نے دیکھا تو حاضر ہوکر اصرار کیا کہ "آپ بھی ضعیف ہیں میرے اونٹ پر سوار ہوں"۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور کہا کہ "میاں یہ راستہ آنکھوں سے طے کرنے کا ہے یوں ہی چلنے دو"۔ اور اس طرح وہ دربار حبیب میں داخل ہوئے۔

چونکہ وہ خود غریب خاندان میں پیدا ہوئے تھے ان کے اکثر اعزا، اور اہل برادری غریب تھے ان کو اپنی شاندار زندگی میں بہت سے غریبوں کی پریشان حالت دیکھنے کا موقع ملا تھا اس لئے ان کو حالت غریبی کا زبردست احساس تھا۔ اُنھوں نے اپنے کنبہ اور برادری میں ایک تجویز پیش کی کہ صرف شادی کی چند تقریبات کے مصرف کو بدل کر اس کا روپیہ غریبوں کی امداد میں صرف کیا جائے۔ سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا اپنے قریبی اعزاء سے عمل کرایا اور اپنی برادری میں اس طریقہ کو رائج کیا۔

اُنھوں نے ندوہ کی بھی پُر جوش امداد کی اور اس کے اہم معاملات میں اکثر اپنے تحریری و زبانی مشورے دیتے اور اراکین سے تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے اور اُس پریشانی میں جو سر انٹونی میکڈانل کے زمانہ میں اراکین ندوہ کو تھی اُنھوں نے پبلک اور پرائیویٹ

طریقوں سے ندوہ کی حمایت کی۔

۱۹۰۳ء میں ان کو وطن کی تعلیمی خدمات و رفرقہ دارانہ فسادات میں امن وصلح قلم کرانے کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر گورنر جنرل با اجلاس کونسل نے ایک سارٹیفکٹ مرحمت کیا اور دربارِ تاجپوشی میں حکومت کی طرف سے مدعو کئے گئے۔

۱۹۰۴ء میں جب لفٹننٹ گورنر نے مراد آباد میں دربار کیا ہی تو اس میں بھی نواب صاحب کی مذکورہ بالا خدمات کا خاص طور پر اعتراف کیا گیا۔

(۱۰)

پولیٹکل معاملات میں نواب صاحب بھی اگرچہ سرسید اور نواب محسن الملک کے ہم خیال تھے اور مسلمانوں کا کانگریس اور کسی ایجیٹیشن میں شریک ہونا بمنزلہ خودکشی کے تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سیاسیات میں حصہ لینا صرف نوجوانوں کا کام ہی چنانچہ انھوں نے اس خیال کو ایک پرائیویٹ خط میں بھی اس طرح ظاہر کیا ہی کہ:-

"ہندوستان میں جس قسم کی حکومت ہو رہی ہی اس کے لحاظ سے رعایا کے لئے عمدہ تریں پالیسی یہی ہی کہ حکام کو حتی الامکان اپنے سے ناخوش ہونے دے اور اس کے برخلاف کوئی کوشش نوجوانوں کا کام ہی، میرے ولولے اب آزادی اور مساوات کے متعلق پست ہو چکے ہیں اور میں اب اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ آرام کے ساتھ گزر جائیں۔"

لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں جب صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے ہندی کے اجراء کے متعلق اپنا مشہور رزولیوشن صادر کیا تو نواب صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور اب ان کے لئے زمانہ کے تغیرات اور سیاسی خیالات و حالات سے بے تعلق رہنا دشوار ہو گیا اور اس رزولیوشن کی احتجاجی کارروائیوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ لکھنؤ کی مشہور میٹنگ میں شریک ہو کر پُرزور تقریر کی اور اسی وقت سے ان کو قومی حقوق کے تحفظ کا خیال پیدا ہو گیا۔ ایک پولٹیکل آرگنائزیشن کو قائم کرنے کی تحریک شروع کر دی، اس مقصد کے لئے سب سے پہلا جلسہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا جس میں نواب صاحب نے ایک طویل تقریر میں اس بات کو ظاہر کرنے کے بعد کہ تمام ہندوستان میں کچھ عرصہ سے مسلمانوں کا درجہ کس طرح روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور خاص خاص صوبوں میں بھی ان کے پولٹیکل حقوق پر حملہ ہو رہا ہے اور اردو ناگری کے مسئلہ پر اشارہ کرتے ہوئے اور یہ کہ سرکاری عہدوں کی تعداد ان میں کس طرح روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور ویسرائے کی قانونی کونسلوں اور صوبوں کی قانونی کونسلوں میں وہ اپنے انتخاب سے اپنے ممبر نہیں بھیج سکتے انھوں نے اپنی ایک اسکیم پیش کی کہ کس طریقہ سے آئندہ ان خرابیوں کا انسداد اور اپنے حقوق کی حفاظت ہم کو کرنی چاہیے، اس اسکیم پر مباحثے ہوئے اور ایک ترمیمہ شکل میں وہ منظور کی گئی۔

اس کو کامیاب بنانے کے لئے نواب صاحب نے مختلف مقامات کے دورے کر کے اہل الرائے اصحاب سے مشورے حاصل کئے اور ہر جگہ جلسے منعقد کرائے اور مجوزہ آرگنائزیشن کے مقاصد بیان کئے۔

نواب صاحب اگرچہ اپنی بیوی کی علالت سے جو موت پر منتج ہوئی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی بیماریوں سے سخت پریشان تھے لیکن قومی کام کی دھن اور اس آرگنائزیشن کی تکمیل کی ضرورت نے ان کو دورے کرنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے اس عالم پریشانی میں اس کام کو تکمّل کیا۔

انھی کوششوں کے دوران میں گورنمنٹ کی جانب سے قانونی کونسلوں میں اصلاحات کی تجویز کا اعلان شائع ہوا تو نواب صاحب نے فوراً ہی نواب محسن الملک سے اس اعلان اور اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے ایک ڈپوٹیشن کے ذریعہ سے ایڈریس پیش کرنے کے مسئلہ پر مراسلت شروع کر دی اور پھر ڈپوٹیشن کے باریاب ہونے اور ایڈریس کی تیاری کے تمام مراحل میں پوری سرگرمی کے ساتھ کام کرتے رہے متعدد جلسہ ہائے مشاورت منعقد کئے اور خود بھی وضاحت سے ساتھ مسلمانوں کی قومی ضروریات وحالات کی یادداشتیں قلم بند کر کے بھیجیں اور جب تمام مراحل طے کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ڈپوٹیشن پیش ہو گیا جس میں وہ خود بھی شریک ہوئے تو ۳۰۔ دسمبر کو ڈھاکہ میں مسلمانان ہند کی ایک پبلک میٹنگ منعقد کرائی اور چونکہ نواب صاحب اس سیاسی مجلس کے بانی تھے، نوجوانان قوم کے اصرار سے ان کو پہلے اجلاس کی صدارت قبول کرنی پڑی اور خطبۂ صدارت میں انھوں نے قومی پولیٹیکل پالیسی کے متعلق اپنی رائے کو ظاہر کیا جو رائے کہ مسلمانوں میں سیاسی تحریک کی بنیاد قرار پائی۔

اس جلسہ میں متعدد تجاویز پاس ہوئیں اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کے لئے ایک پرووژنل کمیٹی قائم ہوئی اور بالآخر مسلم لیگ قائم ہو گئی اور نواب صاحب اس کی سکریٹری

مقرر کئے گئے۔

نواب صاحب نے شملہ ڈپوٹیشن کے میموریل، وسیرائے کے جواب اور لوکل گورنمنٹوں کے نام گورنمنٹ آف انڈیا کے مراسلہ کو شائع کرایا تاکہ مسلمان اہل الرائے غور کر سکیں کہ مسلمانوں کے حقوق کی بہترین حفاظت کے خیال سے کس کس امر کی اور گورنمنٹ سے استدعا کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمقام کراچی اجلاس منعقد ہوا اور لیگ کا کانسٹی ٹیوشن بھی مکمل ہو گیا لیکن چونکہ دسمبر میں آنریری سکرٹری کالج کے عہدہ پر ان کا انتخاب ہو گیا تھا اس لئے لیگ کی سکرٹری شپ سے اس بناء پر استعفا دیدیا کہ وہ دونوں کام انجام نہیں دے سکتے تھے اور مقتضائے مصلحت بھی نہ تھا کہ یہ دونوں ذمہ داری کے کام ایک ہی وجود سے وابستہ رہیں لیکن وہ لیگ کے ممبر رہے اور اس کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً شریک بھی ہوتے رہے۔ انھوں نے لیگ کے ذریعہ سے نہ صرف قانونی کونسلوں میں حق انتخاب تعداد نیابت اور جداگانہ حلقہ انتخاب کی کوشش کی بلکہ اس کوشش کو میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں تک وسیع کیا۔

اسکیم اصلاحات پر مسلم لیگ کی طرف سے غور کرنے کے لئے جو جلسے منعقد ہوئے اس کے مباحث میں پورا حصہ لیا اور آخری اور قطعی تجویزان کے اور میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی کے دستخطوں سے گورنمنٹ میں بھیجی گئی۔ البتہ نواب صاحب نے گورنمنٹ کی ایڈوائزری کونسل میں والیان ملک کے ممبر بنائے جانے سے اختلاف کیا جس میں دوسرے لوگ بھی اپنی قابلیت و تجربہ کی بنیاد پر ممبر بنائے جانے تجویز ہوئے تھے کیونکہ یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ والیان ملک قانون حیثیہ

اور اُسی درجہ کے دوسرے ممبروں کے ساتھ یکساں حیثیت سے مباحثات میں شریک ہوں جس سے ان کا درجہ ان کی رعایا کی نظروں میں گھٹ جاتا۔

اُنھوں نے اس رائے کو اپنی طرف سے علیحدہ لکھ کر گورنمنٹ میں بھیجا اور جب اسکیم اصلاحات طے ہو کر شائع ہوئی تو اس میں سے کونسل کو قطعاً ہی خارج کر دیا گیا۔

کالج کے فرائض نے اگرچہ ان کی سیاسی سرگرمی کم کر دی تھی لیکن دلچسپی بدستور قایم رہی اور اپنے مفید مشوروں سے ہر موقع پر قوم کی سیاسی رہنمائی کرتے رہے۔

(۱۱)

اگرچہ قواعد و قوانین کالج کے لحاظ سے سکریٹری کے انتخاب میں ٹرسٹیوں کے سوا اور کسی طبقہ یا جماعت کو کسی قسم کا حق رائے دہندگی حاصل نہ تھا لیکن نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد ہر گوشۂ ہندوستان سے تمام مسلمانوں نے دلی جوش اور تمناؤں کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا کہ "نواب وقار الملک کو سکریٹری منتخب کیا جائے"۔ اسلامی پریس نے پرزور مضامین شائع کئے کہ "اس عہدہ کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہیں"۔ جا بجا جلسے منعقد کئے گئے اور ٹرسٹیوں کو تاروں کے ذریعہ سے کارروائیوں کی اطلاع دی گئی کہ "ان کے سوا اس جلیل القدر منصب پر کوئی اور مامور نہ کیا جائے" بقول نواب محمد مزمل اللہ خان بہادر کے سی ایس آئی جو اس وقت قایم مقام سکریٹری تھے کہ "مجھ کو گزشتہ پچیس ۲۵ سالہ لائف میں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے جس میں قوم کی

طرف سے کسی امر پر اس قدر شد و مد اور ایسے جوش و خروش اور ایسے اتفاق کے ساتھ
اظہار رائے کیا گیا ہو۔" ٹرسٹیوں کے دلوں میں بھی نواب صاحب کے اخلاق و قابلیت اور
ان کی قومی خدمات کی عزت و عظمت مرکوز تھی اُنھوں نے ۱۵ ۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کے ایک مخصوص
اجلاس میں بلا اختلاف نواب وقار الملک ہی کو آنریری سکرٹری کے عہدہ پر منتخب کیا اور
آخر دسمبر میں اجلاس کانفرنس منعقدۂ کراچی میں کانفرنس کی طرف سے بالاتفاق اس انتخاب
پر اظہارِ مسرت و اطمینان کیا گیا۔ نواب صاحب نے جنوری ۱۹۰۸ء میں اس عہدہ کا چارج
لیا چونکہ ان کے علم میں پہلے سے بہت سے اُمور قابلِ اصلاح تھے اُنھوں نے اُن پر سرگرمی
کے ساتھ اپنی توجہ منعطف کی اور آنریری سکرٹری کی حیثیت سے کالج میں پہلا قدم رکھتے ہی
بالاعلان اس امر کو ظاہر کر دیا کہ "میں پارٹی فیلنگ کو پسند نہیں کرتا، اور نہ صرف ٹرسٹیوں
کی پارٹی میں اس فیلنگ کے پھیلنے کو میں روکونگا بلکہ اولڈ بوائز کی پارٹی فیلنگ کو بھی
حتی الامکان کمزور کرنے کی کوشش کروں گا، اور میں اپنے گرد و پیش کوئی پارٹی قائم
کرنا نہیں چاہتا۔" اُنھوں نے ہمیشہ ہر ایک مخالف و موافق رائے کو نہایت آزادی
اور ٹھنڈے دل کے ساتھ سُنا اور جو رائے کالج کے حق میں مفید تصوّر کی اس سے اتفاق
اور جو مضر معلوم ہوئی اس سے اختلاف کیا اور اس طرح ان کو اپنے ساتھیوں کی رائے
سے بڑی مدد ملتی رہی اور پارٹی فیلنگ بھی کمزور ہوتا رہا۔ ٹرسٹیوں کی تعداد ابتدا سے
ستر چلی آتی تھی لیکن چونکہ ان کا تقرر حین حیاتی ہوتا تھا اس لئے خواہ جدید ضرورتیں
ہوں یا بعض اصحاب اپنے ایثار اور قومی خدمات سے اپنے آپ کو اس جماعت میں شامل

ہونے کے قابل ثابت کریں۔ ان کے تقرر کا موقع نہ ملتا تھا پھر کالج کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہو گیا تھا قوم میں پُرجوش کام کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی اس لئے نواب صاحب نے یہ ترمیم قواعدہ ۲۰ تک تعداد پہنچائی اور ہر سال ایک مناسب تعداد میں مختلف صوبوں سے تعلیم یافتہ اور ہمدرد اصحاب کا انتخاب عمل میں آتا رہا جس سے ٹرسٹیوں کی جماعت کی قوت میں کافی اضافہ ہو گیا۔

اُنھوں نے تقسیم عمل کے اصول پر اور عام دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ٹرسٹیوں کی جماعت میں سے ایک سنڈیکیٹ بنایا اور اس میں انتخاب سے ممبر مقرر کر کے کالج کے تمام شعبوں کو ان پر تقسیم کر دیا اور چند قواعد بطور ضابطہ کارروائی وضع کئے گئے اور اس طرح متعدد قابل اصحاب کو آنریری سکریٹری کی نگرانی میں کالج کے کاموں کا عملی تجربہ حاصل ہونے کے علاوہ کام کرنے کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔

ان میں چونکہ جمہوریت پسندی کا زبردست مادہ تھا اس لئے وہ جمہور کی رائے کی زیادہ وقعت کرتے تھے اگرچہ یہ ضرور نہیں تھا کہ وہ اس سے اتفاق بھی کرلیں اور اپنے آپ کو نہ صرف ٹرسٹیوں کا سکریٹری سمجھتے تھے بلکہ معاملات کالج میں تمام قوم کا سکریٹری تصور کرتے تھے اور ان کی طرف سے عام آزادی تھی کہ جو شخص چاہے معاملات کالج کے متعلق ان سے تبادلہ خیالات کرے اور جہاں تک ان کو فرصت ہوتی وہ دلچسپی کے ساتھ اس قسم کے تبادلہ خیالات کو اپنا خوشگوار فرض سمجھتے اخبارات کی نکتہ چینی سے کبھی کسی بد مزگی کا اثر اُن کے دل پر نہیں ہوتا تھا بلکہ نکتہ چینی کو وہ ایک قسم کی مدد سمجھتے تھے اور ہمیشہ

اس کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا اصول تھا کہ "ہم کو اپنا انتظام درست رکھنا چاہیئے اور پھر اگر کوئی غلط حملہ ہو تو نہایت ٹھنڈے دل سے اس کے جواب میں اصلی واقعات پبلک کے سامنے ظاہر کر دیئے جائیں اور فیصلہ پبلک پر چھوڑ دیا جائے"۔ چنانچہ اس زمانہ میں جس قدر نکتہ چینیاں ہوئیں اگر ان میں صداقت ہوئی تو انھوں نے صاف طور پر قبول کر لیا ورنہ اصلی واقعات پبلک پر ظاہر کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقہ متوسط اور عوام کو کالج کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی اور اس زمانہ میں صحیح اور حقیقی طور پر قومی کالج میں قوم کی آواز کا اثر ہونے لگا۔

سنہ ۱۹۰۷ء کی مشہور اسٹرائک کو بہت تھوڑا زمانہ گزرا تھا نواب صاحب طلباء کے خیالات سے واقف تھے اس لئے انھوں نے جائزہ لیتے ہی طلباء سے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ "میں کالج کا ڈسپلن فوجی کیمپ کے ڈسپلن کی طرح دیکھنا پسند کرتا ہوں اور بورڈنگ ہاؤس کے تمام کمروں کو خالی دیکھنا بہ نسبت اس کے زیادہ پسند کروں گا کہ ان میں نافرمان اور ضابطہ کی پابندی نہ کرنے والے طلباء آباد ہوں"۔ لیکن ساتھ ہی وہ ڈسپلن کو صرف طلباء پر محدود نہ رکھتے تھے بلکہ وہ اسٹاف کو بھی ڈسپلن کے دائرہ میں دیکھنا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک ڈسپلن اسی وقت شگفتگی کے ساتھ قائم رہ سکتی تھی جب کہ اسٹاف اور طلباء دونوں پابند ہوں اسی لئے انھوں نے اسٹاف کے ڈسپلن پر بھی پوری توجہ رکھی۔

عرصہ دراز سے کالج کا یورپین اسٹاف تمام معاملات پر حاوی تھا اور اس نے ٹرسٹیوں کی جماعت پر پورا اقتدار حاصل کر لیا تھا اور نواب محسن الملک بعض اہم مصالح کی بنیاد پر

اس اثر و اقتدار کو برابر تسلیم کرتے رہے تھے مسٹر مارلیسن کے بعد مسٹر آرچبولڈ نے ان روایات اور اس اثر و اقتدار کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ان میں اور اضافہ کیا۔ ان کو آنریری سکریٹری یا بالفاظ دیگر ٹرسٹیز کی نگرانی بھی گوارا نہ تھی۔ آنریری سکریٹری سے ملنا یا مل کر کام کرنا تکلیف کا باعث تھا اور اس کو وہ اپنے رعب داب کے منافی سمجھتے تھے۔ آنریری سکریٹری نے چارج لینے کے بعد طلبا و اسٹاف اور دیگر انتظامات کالج کے متعلق اپنے قانونی اختیارات کا استعمال کیا جو مسٹر آرچبولڈ کو بہت شاق گزرا اور انھوں نے واقعی و غیر واقعی امور کو وجہ شکایات قرار دے کر ایک زبردست پروٹسٹ کیا اور ہز آنر سر لفٹننٹ گورنر (پیٹرن کالج) کو بھی اطلاع دی یوروپین ممبران اسٹاف نے بھی ایک مشترکہ احتجاجی یادداشت پیش کی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ "اب وہ وقت آگیا ہے کہ گورنمنٹ کالج کے معاملات میں دخل دے" اس احتجاج نے ایک نہایت پیچیدہ بلکہ خوفناک صورت حالات پیدا کر دی۔ ہز آنر نے بحیثیت مربی کالج معاملات میں مداخلت کی سکریٹری اور پرنسپل سے بالمشافہ گفتگوئیں کیں لیکن ہنوز کوئی مختتم فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ان واقعات کی اشاعت سے تمام قوم میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا اور پشاور سے لے کر مدراس تک کوئی ممتاز شہر ایسا نہ تھا جس میں قوم نے آنریری سکریٹری پر اظہار اعتماد کر کے اس رائے کا اظہار نہ کیا ہو کہ سکریٹری کے ہاتھ قوی کیے جائیں اور کالج پر قومی نگرانی قائم رہے۔

ٹرسٹیوں کی کثیر جماعت نے بھی حمایت و تائید کی اور اس موقع پر خاص دلچسپی و سرگرمی کا اظہار کیا متعدد اجلاس منعقد ہوئے اور بالآخر اعلان کر دیا گیا کہ آنریری سکریٹری کی کارروائیاں

حدود اختیارات و قانون کے اندر تھیں اور ان کو ان عام اختیارات سے محروم نہیں کیا جاسکتا

پرنسپل کی اس کارروائی کے متعلق کہ اُنھوں نے براہ راست ہز آنر سے مراسلت کی اظہار ناراضی

کیا گیا اور ان کا استعفا منظور کرلیا گیا۔ اور چونکہ اسٹاف نے اپنا جائنٹ نوٹ واپس لے لیا تھا

اس لیے اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہز آنر آنریبل سر جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر و پیٹرن کالج نے اپنے مفید

مشوروں سے نہایت مدد پہنچائی اور ٹرسٹیوں کی رائے کے ساتھ اتفاق کیا اس کارروائی

کا یہ نہایت مفید نتیجہ نکلا کہ یورپین اسٹاف کو اپنے فرائض کے حدود معلوم ہو گئے اور اس کا اثر

و اقتدار ایک مناسب حد تک محدود ہو گیا لیکن باوجود اس شدید اختلاف کے نواب صاحب کی

خاص عظمت مسٹر آرچبولڈ کے دل میں قائم تھی۔ یہ عظمت کیوں قائم تھی؟ اس کا جواب اُنھیں کے

قلم سے زیادہ دلچسپ ہوگا:۔

"نواب وقار الملک مرحوم سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے وہ پرانے خیالات
کے آدمی تھے لیکن ارادہ میں پکے دیانت دار اور اعلیٰ کیرکٹر کے شخص تھے
وہ نئے طریقوں اور نئے خیالات سے زیادہ واقف نہ تھے اس لیے ایم او
کالج علی گڈھ جیسی تعلیم گاہ کے معاملات میں ان کو دشواری پیش آتی تھی
باوجود اس واقعہ کے اور باوجود اس امر کے کہ میں نے اپنے عہدہ کو محض اس
وجہ سے ترک کر دیا کہ کالج کے انتظامی معاملات میں میرا ان کے ساتھ نباہ ممکن
نہ تھا میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی بلاشبہ میں نے اکثر یہ خیال کیا کہ مجھے کبھی
کسی دوسرے ہندوستانی شخص سے ملنے کا موقع نہیں ملا جو اس درجہ

مضبوط کریکٹر کا ہو جس انہماک سے انھوں نے اپنے عیش و آرام کو قربان کر کے قوم کی خدمت کی ہے وہ کسی طرح چھپائی نہیں جا سکتی۔ اگر ضرورت ہو تو میں ان تعلقات کو جو میرے اُن کے ساتھ بسلسلۂ کالج تھے تفصیلی طور پر بیان کر سکتا ہوں لیکن ایسے واقعات اختلاف آرا کا باعث ہو سکتے ہیں اس لئے نظرانداز کر دینا بہتر ہے مجھے پرانے جھگڑوں کے اعادہ کا افسوس ہوگا متعدد وجوہ سے وہ ایک اعلیٰ معمر ہستی تھی جس نے ہمیشہ ہر معاملہ میں صداقت کے ساتھ جنگ کی میری تمنا ہے کہ فی زمانہ نواب صاحب کی قوم میں اُن جیسے اور افراد بھی ہوں عام اس سے کہ ان کی رائے غلط ہو یا درست وہ نہایت دیانتداری سے غور و فکر کرتے تھے۔

نواب صاحب کے سامنے اب ایک اہم مسئلہ پرنسپل کی جگہ معمور کرنے کا تھا۔ اسٹاف کے تمام ممبر اگرچہ جائنٹ نوٹ واپس لے چکے تھے مگر چونکہ ان کی اس کارروائی سے ولوں کو تکلیف پہنچی تھی اس لئے ان میں سے کسی کا تقرر احتیاط کے خلاف تھا مگر نواب صاحب نے اس اصول پر کہ اعتراف غلطی کے بعد اس کو بھلا دینا ہی بہتر ہے مسٹر ٹول کو جو سب سے سینیر تھے انتخاب کیا اور ٹرسٹیوں نے جو پالیسی قرار دی تھی اس کی متابعت کا ایک صاف اقرار ان سے حاصل کر کے اس عہدہ پر ان کو مامور کرا دیا۔

مسٹر ٹول کے انتخاب کے وقت جو امید کی گئی تھی وہ پوری ہوئی اور انھوں نے آخر تک ہم آہنگی اور آنریری سکرٹری کے اختیارات و مرتبہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے فرائض انجام دیئے

[illegible]

خیرات تھی اس لئے اس سے غیرت وحمیت پر بھی برا اثر پڑتا تھا جو قومی کریکٹر کے لئے نہایت مضر تھا۔ نواب صاحب نے ان وظیفوں کا دینا قطعی بند کرکے قرض حسنہ کا طریقہ قائم کیا اور کالج سے جو وظائف پرنسپل کے ذریعہ سے دیئے جاتے تھے ان کا تعلق سکریٹری سے رکھا تاکہ طالب علم کھلے دل سے اپنی قوم کے آدمی کے سامنے بطور راز کے اپنے خانگی حالات کو ظاہر کرسکے۔

کالج کی وسعت اور طلباء کی کثرت کے ساتھ اساتذہ کی تعداد کا اضافہ بھی ہوتا رہا اور ہندوستانی اور یوروپین پروفیسروں کی درجہ بندی کی اسکیم منظور کی گئی اور یوروپین اسٹاف میں ان ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا گیا جنھوں نے کامیابی کے ساتھ ولایت میں تعلیم پائی ہو۔ کالجیٹ اسکول کے مدرسوں کو ٹریننگ کالج میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا تاکہ اسکول کی تعلیم ٹرینڈ ٹیچروں کے ذریعہ سے ہو۔ قابل نوجوانوں کو کالج فنڈ سے یورپ کی یونیورسٹیوں میں تکمیل علوم کے لئے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جن کے ساتھ یہ معاہدہ بھی کیا گیا کہ واپسی کے بعد وہ کالج کی خدمات انجام دیں، اسی کے ساتھ کالج میں فیلوشپ بھی قائم کی، انجینیرنگ و ڈاکٹری کے وظائف جاری کئے اور سائنس کے شعبہ کو ترقی دی۔

نواب صاحب نے ہمیشہ بورڈروں کی مذہبی تعلیم و اعمال مذہب کی پابندی پر زیادہ توجہ رکھی۔ اور اسی غرض سے ہر علیحدہ بورڈنگ ہاؤس کے متعلق ایک پیش امام اور معلم دینیات کا تقرر کیا گیا اور پانچوں وقت نماز کی حاضری لازم کی گئی۔ طلباء کی طبی امداد کو وسیع پیمانہ پر [illegible] کے لئے ایک یونانی دواخانہ کا قیام اور یونانی طبیب اور اسسٹنٹ سرجن کا تقرر

بھی عمل میں آیا طلباء کی تعداد میں غیر متوقع اضافہ ہوا۔ اور ۱۹۱۱ء میں ایک ہزار سے متجاوز ہوگئی اور ۱۹۱۲ء میں بورڈنگ ہاؤسوں کا انتظام نہ ہونے کے باعث سات سو درخواستیں مسترد کرنی پڑیں۔

تعمیرات کی طرف بھی توجہ کی، منٹو سرکل تعمیر ہوا اور اسٹاف کے لئے ضروری مکانات تیار کئے گئے۔

نواب صاحب نے باوجود عوارض اور ضعیف العمری کے متعدد دورے کئے، کراچی اور رنگون تک کا سفر کیا۔ رامپور میں ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر سے اور بھوپال میں علیا حضرۃ سرکار عالیہ دام اقبالہا سے شرف نیاز حاصل کرکے کالج کے حالات اور قومی ضروریات کو گوش گزار کیا۔

ہز اکسلنسی لارڈ منٹو ویسرائے و گورنر جنرل اور صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنروں، مہاراجہ کشمیر، نواب صاحب بہادر رام پور، ہز ہائی نس میر خیرپور سندھ، چیف کمشنر صوبہ سرحد کی نواب صاحب ڈھاکہ، سیٹھ عبدالکریم عبدالشکور جمال برادرس ملک التجار رنگون اور بعض دیگر اکابر قوم نے کالج کا باضابطہ معائنہ کیا۔

علیا حضرت سرکار عالیہ فرمانروائے بھوپال نے بالکل پرائیوٹ طور پر کالج ملاحظہ فرمایا۔ ویسرائے نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس میں آنریری سکریٹری کو "نواب" کا خطاب مرحمت فرمایا، اور اپنے دست خاص سے اس کی سند عطا کی۔

ان جلیل القدر وزیروں کی تشریف آوری سے گراں قدر مالی فوائد بھی حاصل ہوئے

ہز ایکسلنسی کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک وسیع اور عظیم الشان بورڈنگ ہاؤس منٹو سرکل کے نام سے تعمیر کیا جانا تجویز ہوا۔

ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور نے حامد ہال کی تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ عنایت کیا اور حضور ممدوح نے اپنی توجہ اور کوشش سے ہز ہائی نس مہاراجہ گوالیار سے سائنس کالج کی ترقی کے لئے ایک لاکھ روپیہ دلوایا۔ جمال برادرس رنگون نے باون ہزار چار سو پچاس، نواب کرنل حافظ محمد عبید اللہ خاں بہادر سی ایس آئی محسن الملک بھوپال اور راجہ صاحب نانپارہ نے پچاس پچاس ہزار روپیہ اور نواب یار محمد خاں زبیر جاورہ اور سر راجہ تصدق رسول خاں (جہانگیر آباد) نے چالیس چالیس ہزار روپے عطا کئے۔ مہاراجہ بہادر محمود آباد آنریبل سر فاضل بھائی نے دس دس ہزار روپے عنایت کئے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب جوناگڈھ نے پچیس ہزار کا عطیہ دیا۔ ہز ہائی نس میر خیرپور نے پانچ ہزار نقد کے علاوہ دو ہزار روپے سالانہ بارہ سال کے لئے مقرر کئے۔

ان رؤسائے قوم کے علاوہ علیا حضرت سرکار عالیہ فرماں روائے بھوپال نے پانچ ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ عطا فرمائی اور ہز ہائی نس آغا خاں نے اپنی گرانٹ میں اضافہ کیا۔ جمال برادرس نے سو روپیہ ماہانہ مقرر کیا۔ بچھرایوں میں ایک خاتون نے اور کرنال میں نواب صاحب کرنال نے اپنے اوقاف میں کالج کا حصہ لکھا۔

نواب صاحب نے یہ کوشش بھی کی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کالج کی مرکزی حیثیت تسلیم کرے اور اس کو گورنمنٹ آف انڈیا سے امداد ملے۔ چنانچہ اس کے متعلق مراسلت کی اور نتیجہ میں

مرکزی گورنمنٹ سے دو لاکھ روپیہ حاصل ہوا۔ صوبہ کی گورنمنٹ نے سائنس لیباریٹری کے لئے بیس ہزار روپیہ دیا۔ ان یکمشت امدادوں کے علاوہ مستقل آمدنی میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۲ء؁ میں کل آمدنی دو لاکھ تیس ہزار تھی اور خرچ دو لاکھ چھبیس ہزار پانچسو پچیس تھا۔

ان فوائد کے ساتھ نواب صاحب کے زمانہ میں کالج کو سب سے زیادہ مہتم بالشان فائدہ جو گو فوائد کا سرچشمہ ہی یہ پہنچا کہ بھوپال سے پرنس حمید اللہ خاں بہادر (لفٹنٹ کرنل افتخار الملک سی ایس آئی سی وی او) بحیثیت ایک طالب علم کے کالج میں داخل ہوئے۔

نواب صاحب کو اندرونی اصلاحات سے ایک گونہ دلجمعی ہوئی تھی اور وہ کالج کی مالی حالت اور اس سے متعلق شعبوں کی ترقی کی تدابیر میں مصروف تھے کہ دسمبر ۱۹۱۰ء؁ کی آخری تاریخوں میں جب کہ ناگپور میں کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا ہز ہائی نس آغا خان نے اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند کے ورود ہندوستان کے موقع پر محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی امید دلائی اور تحریک کی کہ جس قدر سرگرمی کے ساتھ ممکن ہو اس کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ جنوری میں بمقام علی گڑھ نواب صاحب کی کوٹھی پر ہز ہائی نس کی صدارت میں ایک ابتدائی جلسۂ مشاورت منعقد ہوا جس میں فراہمی سرمایہ کے لئے ایک مقتدر کمیٹی قایم کی گئی۔ ہز ہائی نس آغا خان پریسیڈنٹ اور مختلف صوبوں میں ممتاز مشاہیر اصحاب وائس پریسیڈنٹ قرار پائے اور نواب صاحب سینٹرل کمیٹی کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ ہر صوبہ میں پراونشیل کمیٹیاں قایم ہوئیں اور سنٹرل کمیٹی کا ایک علیحدہ دفتر قایم کیا گیا۔

یونیورسٹی کی اس تحریک کا تعلق چند ہی دنوں میں تمام ہندوستان سے ہو گیا

اور جس قدر اس تحریک کا اثر پھیلتا جاتا تھا اسی نسبت سے مصروفیتوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔
اپیلوں کی تیاری، اخبارات کے مضامین، عام و خاص خطوط کا انبار، اور پھر ڈپوٹیشنوں
میں شریک ہوکر مختلف مقامات کا دورہ اور ہر جگہ مقامی اصحاب سے تبادلۂ خیالات متعدد
کمیٹیوں میں شرکت، شملہ میں حکام تعلیم سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں اور یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن
پر بحث و مباحثہ، پبلک کے اطمینان اور غور کے لئے بعض مضامین اور مسودات کی اشاعت
اخباری اعتراضات اور مضامین کے جوابات اتنا زبردست اور عظیم الشان کام تھا کہ صرف
وقار الملک ہی کی طاقت و ہمت تھی کہ انھوں نے اس پیرانہ سالی اور عوارض لاحقہ
کی حالت میں یہ بار اپنے شانوں پر اٹھایا اور اس میں شک نہیں کہ ان پر جو عام اعتماد
تھا اس کے باعث تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے علاوہ علماء اور
صوفیاء کرام نے بھی کوششوں میں حصہ لیا چندہ میں جس طرح والیان ملک امراء اور تجار
نے لاکھوں اور ہزاروں روپئے عطا کئے اسی طرح غرباء اور مزدوروں تک نے آنے اور پیسے
پیش کئے اور ۳۰ جولائی ۱۹۱۲ء تک یعنی ڈیڑھ سال میں چھبیس لاکھ انتیس ہزار چار سو ترسٹھ
روپیہ نقد جمع ہو گیا۔ تین لاکھ چھہتر ہزار سرمایہ وظیفہ دوامی میں حاصل ہوا اور پینتیس ہزار
ایک سو ترسٹھ روپیہ پراونشیل کمیٹیوں کی تحویلات میں موجود تھا۔

وعدوں کے بعد چندوں کی وصولی بھی نہایت سخت کام ہوتا ہے اور پھر جب کہ اس کا
تعلق ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہو۔ نواب صاحب نے اس معاملہ میں بھی خاص کوشش کی
لیکن انھوں نے اس تجویز کے اتباع میں کہ تمام ٹرسٹی اور اولڈ بوائز اور کانفرنس کی

سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر اپنی ایک ماہ کی آمدنی یونیورسٹی فنڈ میں دیں جب تک اپنا چندہ ادا نہیں کر دیا کسی شخص پر تقاضا نہیں کیا اور نہ تقاضے کے کسی کاغذ پر دستخط کئے۔

ان تمام اخلاقی اور مادی فوائد کے لحاظ سے بلاخوف تردید ان کے زمانہ کو عصر طلائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ان کی تندرستی پر اس محنت شاقہ کا بہت سخت اثر پڑا۔ اُنھوں نے جس وقت آنریری سکریٹری کے عہدہ کو قبول کیا ہے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ "میرے لئے کام کرنے کا وقت گزر چکا ہے، عمر انحطاط پر ہے، قویٰ کمزور ہو گئے ہیں اور بعض عوارض بھی لاحق ہیں، میرا وقت مکان پر رہنے اور آرام و استراحت کرنے کا ہے مگر میرے عذرات کی سماعت میرے دوستوں اور بزرگوں نے نہیں فرمائی اور انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمہ داری کے عظیم الشان کام کو قبول کروں ان کے عنایت آمیز اصرار کا جواب نفی میں دینا اور ان کی آزردگی کا باعث بننا میرے لئے ناممکن تھا مجبوراً میں نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا۔" اب اگرچہ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کے سی ایس آئی ان کے سرگرم اور قابل جائنٹ سکریٹری اپنے وسیع کاروبار اور راحت و آرام کو قربان کر کے کامل انہماک کے ساتھ ان کی معاونت کرتے رہتے تھے اور باہمی اعتماد و اطمینان بھی تھا۔ نواب صاحب کی بہتر سال کی عمر ہو چکی تھی امراض کا حملہ جلد جلد اور تیز تر ہوتا تھا اور وہ پورے طور پر اپنے عہدہ کے فرائض کو جو ان کی ذات پر عائد تھے انجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے انھوں نے اس عہدہ پر رہنا دیانت کے خلاف سمجھا اور استعفا پیش کر کے اصرار کے ساتھ منظور کرایا

اور ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو ساڑھے چار سال سخت انہماک اور قومی درد کے ساتھ ان خدمات و فرائض کو انجام دے کر سبکدوش ہو گئے۔ ٹرسٹی صاحبان نے استعفا منظور کرتے ہوئے ایک بہت طولانی رزولیوشن میں نواب صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا اور آخر میں یہ جملہ تحریر کیا کہ :-

"کالج کو جس درجہ پر ہر اعتبار سے ترقی اور اعتماد عام کی حالت میں جناب ممدوح نے اس وقت چھوڑا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جب کہ جناب ممدوح نے اس کا چارج بحیثیت آنریری سکریٹری لیا تھا"

تمام پبلک نے بھی عام طور سے افسوس کیا اور ہر طرف ان کے عظیم الشان کاموں اور بے لوث خدمات کی شکر گزاری کی گئی۔

یہاں ہم مسٹر ٹول کے ایک خط کا اقتباس بھی مناسب سمجھتے ہیں جن کو ایک ناگوار واقعہ کے بعد ان کے ساتھ عرصہ تک کام کرنے کا تجربہ ہوا تھا۔

"نواب وقارالملک با اخلاص مذہب کے پابند اور بڑے زبردست کریکٹر کے شخص تھے ان کو زمانہ کا اور آدمیوں کا بڑا تجربہ تھا اور اس وقت میں وہ اس کامل ثابت ہوئے جب کہ ان کو اہم معاملات پیش آئے۔ ان کا استقلال بڑا زبردست تھا وہ ایسی عمر میں بھی محنت سے کام کرتے تھے جب کہ اکثر لوگ مشکل سے کام کرنا بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی ترقی اور کالج کی بھلائی میں انکی قوت عمل سے کام لیتے تھے باوجود کریکٹر کی اس طاقت اور ارادہ کی مضبوطی کے

ان کی طبیعت نرمی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔

ان کو بچوں سے بہت زیادہ انس تھا اور ان میں ہر وقت گھرے رہنے کو پسند کرتے تھے ان کی جدائی سے قوم ایک لیڈر اور کالج ایک سرگرم کارکن سے محروم ہو گیا جس کی تلافی دشوار ہے"۔

(۱۴)

۱۹۱۱ و ۱۹۱۳ء میں جنگ طرابلس و بلقان، ایران میں روسی فوج کا داخلہ، تقسیم بنگال کی تنسیخ، یونیورسٹی کے متعلق خلاف امید گورنمنٹ کے اعلانات و مراسلات، کانپور کی مسجد کا انہدام، یہ چند ایسے واقعات تھے جن سے مسلمانوں میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ ہر دل میں رنج و غم کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور عام مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ نواب صاحب بھی ان حالات و واقعات سے متاثر تھے۔ ممالک اسلامیہ کے متعلق ابتدا سے ہی وہ اپنے ماسبق جانشینوں کے خیالات سے مختلف خیالات رکھتے تھے اور کبھی انھوں نے اس مذہبی ہمدردی کو جو ان ممالک کے ساتھ تھی کسی مصلحت سے مخفی نہیں رکھا۔ انھوں نے کالج میں طرابلس کے چندہ کی عام اجازت دی اور سب سے پہلے اپنا چندہ پیش کیا۔ اور جب طلباء نے ایک وقت کا گوشت وغیرہ چھوڑ کر اس کی بچت کو فنڈ میں دینے کی تجویز کی تو اس تجویز پر سب سے پہلے خود انھوں نے عمل کیا۔ اسی طرح انھوں نے عید کی مبارکبادیوں کے جواب تار دینے کی جگہ خطوط سے دیئے اور جو روپیہ کہ تاروں میں خرچ ہوتا اُس کو مصیبت زدگان طرابلس کے

امدادی چندہ میں جمع کرایا۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں الحاق بنگالین اور تنسیخ تقسیم کے اعلانِ شاہی کے بعد جو بنگالیوں کے استقلال اور ایجی ٹیشن کا نتیجہ تھا انھوں نے اس مایوسانہ حالت کا اندازہ کر کے جس کی وجہ سے بعض مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کا خیال پیدا ہو گیا تھا ایک مضمون کے ذریعہ سے اپنی پولیٹیکل پالیسی کو صاف اور نمایاں طور پر ظاہر کر دیا۔ اس مضمون میں اُنھوں نے الحاق سے جو مسلمانوں کے حق میں مضر اثرات تھے ان کو دکھا کر لکھا کہ:۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہئے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے پئے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائیگی اور اس لئے اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا...... لیکن اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔ ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہئے۔ وفاداری خود غرض ہے وہ چیز نہیں ہے۔ اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قایم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہو گی۔ پس مسلمان جو من حیث القوم

نیشنل کانگریس سے اب تک علیحدہ ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم
دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں۔ ان کا سوراج مسلمانوں
کے حق میں تباہ کن ہے۔ برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہندوستان سے اٹھ جایا
اس کا اثر بہت کم رہ جانا مسلمانوں کے حق میں بربادی بخش ثابت
ہوگا یعنی ایک ہی چیز جو ہمارے ابنائے وطن کے حق میں خوش قسمتی
سمجھی جا سکتی ہے مسلمانوں کے حق میں (جن کی مردم شماری اس ملک
میں کم ہے) وہ سم قاتل ہے۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے الحاق کا جو بھی نتیجہ
نکلے اُس سے مذکورہ بالا کلیہ باطل نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں ہندوستان میں
رہنا ہی تو برٹش گورنمنٹ سے بگاڑ کر رہنا یہ ہمارے لئے ٹھیک نہوگا۔
گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور اس کے ساتھ شریک رہنا یہ
خود ہم کو اپنے استحکام میں کوشش کرنا ہے۔ لہذا اس قسم کے خیالات سے
ہم کو احتراز کرنا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ بسا اوقات مایوسیاں انسان کو خودکشی
پر آمادہ کر دیتی ہیں اور یہ خیال کہ اب ہم کو کانگریس کے ساتھ شامل ہو جانا
چاہیے اس قسم کی مایوسیوں کا نتیجہ ہے کہ جس کی ذمہ دار موجودہ گورنمنٹ ہے
لیکن خودکشی کی صلاح کسی وقت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ لامحالہ ہم کو
سوچنا پڑتا ہے کہ آئندہ ہم کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔۔ .... یہ تو
آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے

بعد جواب مشاہدہ میں آچکے یہہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ
کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں
رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسا کرنا چاہیئے اور وہ ہماری
اپنی قوت بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل ابنائے وطن نے پیش
کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے۔"

اس کے بعد ان تدابیر کو بیان کر کے جن پر مسلمانان بنگال کو فوراً کاربند ہونا چاہیئے
تعلیمی کوششوں کو وسیع اور قوی کرنے پر زیادہ زور دیا۔ اس الحاق سے مسلمانان بنگال
کو جو نقصان پہنچا اور مسلمانوں کے حقوق کو جس طرح نظر انداز کیا گیا اس سے وہ بہت
متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس اثر کو یوں ظاہر کیا ہے کہ:

کم از کم مسلمانوں کا یہ کام تو ضرور رہے کہ ایک مضبوط کوشش کے ساتھ
بتلا دیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی مسلمانوں
میں نہایت مایوسانہ خیالات سے دیکھی گئی ہے کہ دونوں بنگالہ کے الحاق کے
ساتھ گورنمنٹ نے مطلق بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی کہ ساتھ ہی ساتھ
مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا کہ ان کی ترقی پزیر حالت اور حقوق کی
حفاظت فلاں فلاں ذریعہ سے کی جائیگی۔ گورنمنٹ کی یہہ پالیسی بمنزلہ
ایک توپخانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا اور
اس احساس سے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان باقی ہے

اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ کس کا مراکو اور کس کی ٹروپولی اور کہاں کا ایران یہاں سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً"

اسی زمانہ میں روسی فوج ایران میں داخل ہو گئی تھی۔ برطانیہ نے بھی اپنے فوائد کی حفاظت کے لئے اپنی فوجیں اُتاری تھیں اور اس طرح ان دونوں طاقتوں کے درمیان ایران کے پس جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایران کے علاوہ ٹرکی اور افغانستان بھی زد پر تھے۔ نواب صاحب نے ان حالات کے متعلق بھی نہایت آزادی کے ساتھ اپنے جذبات و خیالات کو اس طرح ظاہر کیا کہ:۔

"اسی کے ساتھ جب مسلمان دیکھتے ہیں کہ مراکو فرانس کے پنجہ میں گرفتار ہو گیا اور ٹونس پہلے ہی سے مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر فرانس کے قبضہ میں ہے، طرابلس پر اٹلی نے مصیبت ڈھا رکھی ہے، مصر انگریزی قبضہ میں ہے تو ایسی حالت میں ایران پر جو کارروائی اب روس و انگلستان کی طرف سے ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے اگر مسلمان یہ خوف کرتے ہیں کہ یورپ کی سلطنتوں نے اسلامی حکومتوں کے مقابلہ کے واسطے باہم کوئی قرارداد کر لی ہے تو ان کا یہ خوف کچھ بے جا نہیں ہے اور اس خوف کے بعد جو پریشانی مسلمانوں میں نہ ہو وہ کم ہے ...... اسی یہ مسئلہ ہندوستان کے

مسلمانوں میں شیعہ اور سُنّی کا مسئلہ نہیں رہا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنّی ہوں ان کو ایران کے ساتھ اب یکساں ہمدردی ہے اور ہونی چاہیئے۔"

اس کے بعد وزراء کی پالیسیوں پر بحث کر کے لکھا کہ :-

"ہم پھر کہتے ہیں اور بتاکید کہتے ہیں کہ اس موقع پر مسلمانوں کو کامل اتحاد کے ساتھ ایران کی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے جس میں شیعہ اور سُنّی کا کوئی نام نہ آنے پائے۔"

پھر تمام معاملات پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اظہار ہمدردی کا جو طریقہ اختیار کریں اس کو علی الاعلان عمل میں لائیں، اور آخر میں لکھتے ہیں کہ :-

"جب انسان کا دل بھرا ہوتا ہے تو بات لمبی ہو ہی جاتی ہے۔ اس وقت ایران کی حالت اور اس کے انجام کا جس وقت تصور بندھ جاتا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ مگر مایوس کسی وقت نہ ہونا چاہیئے۔ ومن بعد ما قنطو اینتشر رحمتہ کو ورد زبان رکھنا چاہیئے مضطر کی دعا خدا جلد قبول کرتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ پردۂ غیب سے اب بھی کچھ ایسے اسباب مہیا ہوں جو مسلمانوں کے عام اطمینان کا باعث ہو جائیں۔"

یہ مضامین اگرچہ انھوں نے آنریری سکریٹری کالج کی حیثیت سے نہیں لکھے لیکن اسی زمانہ میں لکھے جب کہ وہ کالج کے آنریری سکریٹری تھے اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئے تھے

جو بعد کو ہندوستان کے تقریباً ہر اخبار میں نقل کئے گئے یہ پہلے مضامین تھے جن کو ایک ذمہ دار اور با اثر لیڈر نے قدیم پالیسی سے متجاوز ہو کر لکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقیقی لیڈر اور رہنما کی عین شان کے مطابق تھے اور کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی پر ان مضامین سے بہت اثر پڑا۔

آنریری سکریٹری کے عہدہ سے مستعفی ہونے پر کالج اور مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے ان کی دلچسپی بدستور قایم رہی اور اُس حد تک جہاں تک صحت نے اجازت دی ان کارروائیوں میں عملی حصہ لیتے رہے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جب کہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے حلقۂ اثر کو صرف علی گڈھ تک محدود رہنے اور بجائے محمڈن یونیورسٹی کے علی گڈھ یونیورسٹی کا نام تجویز کئے جانے اور نظام اساسی کے بعض حصوں کے متعلق اپنا اعلان صادر کر دیا تو اس سے قوم میں ایک سخت ہیجان برپا ہو گیا اور کسی طبقہ کے کسی شخص نے بھی اس اعلان کو بغیر رنج و افسوس کے نہیں دیکھا اور ایسی یونیورسٹی کے قبول کرنے سے انکار کا زیادہ امکان نظر آنے لگا تو نواب صاحب نے اپنی ایک مبسوط رائے قوم کے سامنے پیش کی جس میں گورنمنٹ مراسلہ اور اختیارات الحاق اور نام کے مسئلہ اور اس امر پر بحث کر کے کہ اگر باوجود ہر امکانی کوشش کے مجوزہ یونیورسٹی نہ مل سکے تو ایک آزاد "جامعہ اسلامیہ" قایم کیا جائے۔ جس کے ذریعہ سے عورتوں کی اور ایسے گروہوں کی تعلیم کا جو سرکاری ملازمتوں یا ڈگریوں کے خواہاں نہیں اور صرف تعلیم کے خواہاں ہیں، انتظام کیا جائے۔ مثلاً بڑے بڑے مسلمان،

امرا، تجار، علما، اطبا اور وہ لاکھوں شرفا جو زمانہ حال کی سرکاری تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے اور مختلف پیشوں، حرفتوں اور خانگی ملازمتوں کے ذریعہ سے اپنی روزی پیدا کرنے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے اس تجویز میں ان تمام شعبہ ہائے تعلیم پر بھی بحث کی جو جامعہ اسلامیہ میں قایم کئے جا سکتے ہیں اور ساتھ ہی امیدواران ملازمت وغیرہ کی تیاری کے لئے محمدن کالج اور اسلامیہ کالج لاہور کو اس جامعہ کا ایک شعبہ بنانے کی تجویز کی اور ذریعہ تعلیم "زبان اردو" کو قرار دیا ہے لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے اور جس طرح یونیورسٹی کی تحریک نے ترقی کی اور نواب صاحب اپنی سخت معذوریوں کے باعث پبلک لائف سے کنارہ کش ہو گئے اس لئے اس رائے کو ناممکن العمل قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ نے اور ہندوؤں کی نیشنل یونیورسٹیوں نے اس اسکیم کو قابل عمل کر دکھایا اور اگر مولانا محمد علی کا جامعۂ اسلامیہ غیر موافق حالات میں قایم نہ کیا جاتا تو اس اسکیم کی ایک نہ بر دست عملی شکل ہوتی۔

بلقان وار کے سلسلہ میں ہلال احمر کے لئے مسلمانوں نے جو چندے کئے نواب صاحب نے اس میں بھی شرکت کی اور اس وقت اگرچہ وہ روپیہ سے تنگ تھے لیکن انھوں نے ایک حقیت فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ اس فنڈ میں عطا کیا اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کے طبی مشن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی اور جب یہ مشن اپنی اسلامی خدمات ادا کر کے واپس آیا اور سنہ ۱۹۱۴ء میں اس نے ترکی مجروحین کی امداد کے لئے دہلی میں ترکی اشیاء کی ایک نمائش منعقد کی تو نواب صاحب نے اس کا افتتاح کیا اور اڈریس کے جواب میں ایک حوصلہ افزا

اور ہمدردانہ تقریریں کی۔

ترکوں کی اس حالت کا ان پر اس قدر زبردست اثر تھا کہ یونیورسٹی کے چندوں پر ہلال احمر کے چندوں کو مقدم رکھا چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا کہ:۔

"چونکہ اس عرصہ میں مسلمانوں پر ایک مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہی اور ہم کو طرابلس اور بلقانی جنگ کی وجہ سے سب سے زیادہ ضرورت ہلالِ احمر کے واسطے چندہ جمع کرنے کی ہی لہٰذا اس وقت میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جن لوگوں نے مسلم یونیورسٹی کے واسطے چندوں کا وعدہ کیا ہی وہ اپنا موعودہ چندہ مہربانی سے جلد ادا کر دیں کہ "ان العھد کان مسئولا" ایفائے عہد کے لئے خداوند تعالیٰ کا سخت حکم ہی۔ باقی کے لئے چندوں کی میں اس وقت تک یونیورسٹی کے واسطے اپیل نہ کروں گا جب تک کہ ہلالِ احمر کی ضرورتوں سے قوم کو بوجہ احسن سبکدوشی نہ ہو۔

اس وقت تو جو کچھ کسی سے بن پڑے وہ ہلالِ احمر کے فنڈ میں جمع کر دے جس سے زیادہ کوئی شدید ضرورت بالفعل مسلمانوں کی نہیں ہو سکتی"۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا جو واقعہ ہوا اور مزاحمت کرنے والے مسلمانوں پر مسٹر ٹائلر کلکٹر نے فیر کرائے جس سے بہت کچھ اتلافِ جان ہوا اور اس کے بعد مسلمانوں پر مقدمے چلائے گئے تو قوم میں ایک سخت جوش پیدا ہو گیا۔ نواب صاحب بھی ان واقعات سے سخت متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی آزادانہ رائے

اور اسلامی جذبہ کو علی الاعلان ظاہر کرنے میں تامل نہیں کیا، انھوں نے "کانپور کا ہنگامۂ محشر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں ان قانون پیشہ اصحاب کی خدمات کا جنھوں نے ان گرفتار شدہ مسلمانوں کی طرف سے پیروی کی تھی شکریہ اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور پھر ایسے واقعات کے انسداد کے لئے قوم کو یوں توجہ دلائی کہ:-

"بد مزاج سے بد مزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بد مزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانان صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں۔ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک ٹائلر نہیں آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہیے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لئے ٹائلر ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعۃً ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتیگا اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں۔"

۱۴۔ ۱۹۱۴ء میں ... حملوں اور خصوصاً قالب کے دوروں سے ان کو بہت ہی

ناتواں اور مضمحل بنا دیا تھا لیکن ۱۹۱۵ء تک جب تک کہ وہ بالکل ہی مجبور و معذور نہو گئے
اپنی زبردست قابلیت، مضبوط کریکٹر اور اعلیٰ قوتِ ارادی سے قوم کی سیاسی و تعلیمی رہنمائی
کرتے رہے۔ اور اس ہیجان و جوش اور اضطراب و مایوسی کے سالوں میں ان کے مشورے
قوم کے لئے شمع ہدایت اور ان کی ذات باعثِ تسکین و سکون تھی وہ اپنی خرابی صحت کے
باعث قومی مجالس میں بہت ہی کم شریک ہوتے تھے لیکن ان کا گھر بجائے خود ایک مجلس
شوریٰ بن گیا تھا اور دور دور سے قوم کے سر بر آوردہ اصحاب مشوروں اور تبادلۂ خیالات
کے لئے آتے رہتے تھے۔ ان کی صداقت پر گورنمنٹ کو بھی کامل اعتماد تھا اور اعلیٰ حکام کھلے
دل سے ان کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں گفتگوئیں کرتے تھے چنانچہ اس آخری زمانہ
میں ہز آنر سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر اور مسٹر (موید الملک) سید علی امام کے سی ایس آئی
لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کی آمد بھی ان ہی اغراض پر مشتمل تھی۔

ان کے پاس ہر صبح ڈاک کا ایک انبار رہتا تھا اور وہ فرداً فرداً جب تک کہ ہاتھوں
میں طاقتِ تحریر رہی اپنے ہی قلم سے جواب لکھتے رہتے تھے۔

اس زمانہ میں بعض نہایت با اثر اور بارعب ہستیاں میدانِ عمل میں آئیں جن کی
پالیسیاں خاص اغراض اور خاص نقطۂ نظر پر مبنی تھیں لیکن نواب وقار الملک کی شخصیت
کبھی کسی سے مرعوب و متاثر نہیں ہوئی۔ انھوں نے اسی رائے اور خیال کا اظہار کیا
جس کو قوم کے لئے مفید سمجھا اور ان امور سے آزادی کے ساتھ اختلاف کیا جو ان کے
نزدیک قوم کے لئے مضر یا حمیت اسلامی کے برخلاف تھے۔۔

وہ کبھی جوشِ جذبات سے مغلوب ہو کر کام نہیں کرتے تھے بلکہ جذبات پر غالب آ کر اور معاملہ پر غور کر کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتے تھے۔ وہ سخت سے سخت پیچیدہ معاملات میں اپنے اعلےٰ اصول سے ایک انچ بھی ہٹنا گوارا نہ کرتے تھے خواہ کچھ ہی نتیجہ اور انجام ہو۔ ان کی کامیابی کا راز سیاسی عیاری، زمانہ سازی، فصاحت و بلاغت، شیریں سخنی و خوش بیانی میں نہ تھا۔ بلکہ استقلال و اعتدال، مضبوطی دلائل، وقار اور صبر و سکون اور اپنے ایمان و صداقت پر اعتماد میں مضمر تھا۔

ان کی زندگی محرری سے معتمدی تک نہایت سادہ تھی۔ ترفع اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خواہ غریب ہوں یا امیر یکساں سلوک کرتے تھے اور کبھی کسی غریب کو ان کے پاس ان کے برتاؤ سے اپنی غریبانہ حالت کا احساس نہیں ہوا۔ پنشن لینے کے بعد باوجودیکہ وہ قصبہ سے باہر پُرفضا کوٹھی اور محل تعمیر کرا سکتے تھے لیکن انھوں نے محلہ کی گنجان آبادی میں اپنے غریب عزیزوں اور اہلِ وطن کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور ہمیشہ ان کے دکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک رہے۔

ہمدردی و فیاضی ان کا خمیرِ فطرت تھی اور اسی سبب سے حیدرآباد کے زمانہ میں بھی وہ کبھی آسودہ حالی سے زندگی بسر نہ کر سکے۔ پنشن کے بعد بھی اعزا اور غربا کی امداد میں دو ڈھائی سو روپیہ ماہانہ معینہ رقم کے علاوہ اور بھی بقدرِ استطاعت سلوک کرتے رہتے تھے لیکن اس سلوک میں یہ ناممکن تھا کہ شرعی مدارج سلوک کو نظرانداز کر دیں۔

وہ زمیندار تھے اور زمینداری میں کاشتکاروں کے ساتھ جو آئے دن جھگڑے کرنے پڑتے

ہیں ان کو کچھ زمیندار ہی خوب جانتے ہیں لیکن ان کا زمیندارانہ تعلق ایک مثال تھا۔ کاشتکاروں سے ان کی ہمدردی ضرب المثل تھی اور وہ ہمیشہ رعایت، مسامحت اور فیاضی کا برتاؤ کرتے تھے۔ خراب فصلوں اور خراب موسموں میں بسا اوقات لگان ہی معاف نہ کرتے تھے بلکہ ان کو مدد دیتے تھے اور قصبہ میں ان کا گھر اپنے کاشتکاروں کے لئے مہمان سرا تھا۔

وہ حقوق ادا کرنے میں امکانی عجلت سے کام لیتے تھے۔ حیدرآباد میں جب ان کو چار سال کی پوری تنخواہ دی گئی تو اسی وقت انھوں نے پہلی بیوی کا مہر ادا کر دیا، پنشن کے بعد جب دوسرا عقد کیا اور جب ان کے انتقال کے بعد تیسرے عقد کی نوبت آئی تو انھوں نے حیدرآباد کا مکان فروخت کر کے ذوی الحقوق کے کل حقوق ادا کر دیئے اور محجوب الارث ورثاء کو کبھی صلۂ رحم سے محروم نہیں رکھا۔

وہ اگرچہ تعلیم جدید کے منادی اور اس کی اشاعت میں سرگرم کارکن تھے لیکن عقائد میں راسخ اور اعمال مذہب کے سخت پابند تھے اور تمام مسلمانوں کو اصلی مذہبی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لئے انھوں نے کالج میں مذہبی تربیت و تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ زور دیا تھا اور جامعہ اسلامیہ کی اسکیم کا سب سے بڑا منشا یہی تھا کہ مسلمانوں میں اصلی زندگی پیدا ہو۔ اس اسکیم میں ایک موقع پر مسلمانوں کی اخلاق و اعمال مذہب سے بیگانگی و بے پروائی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:۔

"یہ عصبیت اور اسی قسم کی اور بہت سی مصیبتیں ہیں جن کی وجہ سے

مسلمان ہر ایک قسم کی اصلی ترقیات سے بالکل محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اور جن کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمارے علماء کی تعلیم اور فیضِ صحبت سے مسلمانوں کو قرآنِ پاک کی ہدایتوں کی طرف راغب کیا جاوے تسخیر ممالک سے قطع نظر کرو۔ یہ ہنڈتی پھرتی چھائوں ہے۔ انسان کی اصل ترقی اس کے اخلاق کی ترقی ہے۔

پیغمبر خدا صلعم نے مکارم اخلاق ہی کی تکمیل کو اپنی بعثت کی علتِ غائی قرار دیا ہے۔ اب اسلام کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو کہ مسلمانوں نے اپنے مکارم اخلاق میں کیسی اعلیٰ درجہ کی ترقی کی تھی جس کی بدولت ایک جاہل شخص سے بھی ان محاسن کا ظہور ہوتا ہے جس کی بڑے بڑے شائستہ عالموں اور سائنس کے ماہروں اور فلاسفروں سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی افسوس ہے کہ ہماری قوم سے یہ قوتیں سلب ہوگئی ہیں اور سلب ہوتی چلی جاتی ہیں اور انہی مردہ قوتوں کو زندہ کرنے کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے، اور جب قوم میں یہ زندگی پیدا ہو جاتی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قوم زندہ ہوگئی اور چند امیدواران ملازمت کو آج جس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے اُس سے قوم میں وہ زندگی عود نہیں کر سکتی جس کی ضرورت ہے۔"

وہ اسلامی مدارس عربیہ کے بڑے حامی تھے انھوں نے حیدرآباد میں اپنے اقتدار کے زمانہ میں جس طرح کالج کو فائدہ پہنچایا اسی طرح مدرسہ دیوبند کا سالانہ بھی مقرر کرایا۔ غرض پورے پچاس سال انھوں نے صداقت و ایثار کے ساتھ قوم کی خدمت میں

بسر کئے اور جس وقت ان کی حالت اس نوبت پر آگئی کہ کام کرنے سے معذور ہوگئے تو وہ محض احساس فرض کے لحاظ سے لیگ کی ممبری سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن ان کی عظیم الشان خدمات کے لحاظ سے ٹرسٹیوں اور لیگ کے ممبروں نے گوارا نہ کیا کہ زندگی ہی میں ان کا تعلق کالج اور لیگ سے منقطع ہو جائے اس لئے ٹرسٹیوں نے ان کو کالج کا وزیٹر بنایا جو ایک قسم کا اعزازی عہدہ تھا۔ اور لیگ نے وائس پریزیڈنٹ منتخب کرکے ان کا تعلق قایم رکھا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں ان کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی۔ تکلیفات بہت بڑھ گئی تھیں نشست و برخاست سے بھی معذور ہو گئے تھے اور آخر میں ہوش و حواس بھی باقی نہیں رہے تھے۔

انھیں تکلیفوں میں تقریباً ایک سال گزار کر ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۱۷ء کو شنبہ کے دن رات کے ایک بجے ان کی روح داعیِ اجل کی صدا پر لبیک کہتی ہوئی جسم خاکی کو چھوڑ کر فردوس بریں میں راحت گزیں ہوگئی۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

صبح کو ان کی لاش آبائی قبرستان میں اعزاء و اقرباء کے پہلو بہ پہلو دفن کی گئی۔

(۱۴)

اس واقعہ کی خبر سے جو اگرچہ غیر متوقع نہ رہی تھی تاہم اس کے سنتے ہی تمام قوم کے دلوں میں ایک شفیق و عزیز لیڈر اور خالص و مخلص رہبر کی دائمی جدائی سے رنج و الم کے جذبات موجزن ہو گئے۔ کالج کے ٹرسٹیوں اور طالب علموں کی خواہش و تمنا تھی کہ اس ساکت جسم کو جو ۵۰ سال

تک قومی خدمات میں برابر متحرک رہا کالج کے احاطہ میں اس کے رفقاء کے ساتھ دفن کیا جائے لیکن وقت گزر چکا تھا اور تدفین ہو چکی تھی۔

ہر گوشۂ ملک سے ان کے فرزند مشتاق احمد (صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا) کو تعزیت کے پیغام موصول ہوئے جن میں نہایت گہرے رنج و افسوس کا اظہار تھا۔ ان پیغامات تعزیت میں ہز آنر سر جیمس میسٹن کے یہ الفاظ جو انھوں نے اپنے پرائیوٹ خط تعزیت میں لکھے تھے کہ: "ان کی زندگی شاندار تھی اور انھوں نے اپنی قوم کے لئے ایک عظیم جنگ کی اور اچھی عمر پا کر اور پوری شہرت حاصل کر کے اب انتقال کیا"۔ اس امر کا ثبوت ہیں کہ گورنمنٹ سرکل میں بھی ان کی صداقت کا کس قدر زبردست اثر تھا سچ ہے الحق یعلو ولا یعلی۔

اخبارات میں بکثرت مضامین شائع ہوئے جن میں ان کی قومی خدمات اور محاسن و فضائل کا تذکرہ تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر (ممبر انڈیا کونسل و وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے ایک زبردست مضمون میں ان کے قابل مثال اخلاق اور خدمات پر تبصرہ کیا۔

ان تمام مضامین میں مولوی سید سلیمان صاحب (ندوی) اڈیٹر معارف کا ایک مختصر سا جامع مضمون جو معارف میں شائع ہوا تھا اس اندازہ کے لئے کہ نواب صاحب کا اپنی قوم پر کیسا زبردست اثر تھا ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

قافلہ کا آخری مسافر

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخنوری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا۔ لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا کرتے ہیں، اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ ہستی گرانمایہ جس نے ہماری دنیا کو ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھی منتہی ہو گیا! وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہو گیا! یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے تیلے نہ ہونگے بلکہ انگریزی درس گاہوں کے ہیٹ اور جیسے ہوں گے اب مشرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا، بلکہ مغرب۔ اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لئے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا، بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ فیا ویلاہ علی فقید الاسلام، ویا خیباہ للمسلمین!

مسلم لیگ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور کالج کے ٹرسٹیوں نے اپنے اجلاسوں میں

تعزیتی رزولیوشن پاس کئے اور ان کی تعلیمی خدمات اور اس جدوجہد کا جو انھوں نے قوم کے حقوق و مقاصد کے حصول میں کی تھی اعتراف کیا۔

ان کی زندگی، ان کا طریق عمل، ان کا طرز کارروائی اور ان کا کریکٹر قوم کے نوجوانوں کے لئے ایک سبق تھا چنانچہ (مولانا) شوکت علی اپنے ایک خط مورخہ ۴ فروری ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں کہ: "ہم لوگوں کی مادہ پرست اور رفوق البھڑک زندگیوں میں جو کچھ انقلاب آیا نظر آتا ہے اس کو پیدا کرنے والی نواب صاحب مرحوم کی سادہ اسلامی زندگی کی مثال تھی ...... جو احسانات نواب صاحب مرحوم نے ہم نوجوان مسلمانوں پر کئے ہیں اس کا اجر تو خدا سے ان کو ضرور ملے گا ان کی زندگی نے اسلامی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں میں بٹھایا اور ہم کو دکھایا کہ اس بیسویں صدی میں بھی مسلمان آسانی کے ساتھ دینی اور اسلامی زندگی بسر کر کے قوم و ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔"

غرض اس زمانہ کے مشاہیر میں خداوند تعالےٰ نے یہ شرف انھیں کے لئے مخصوص کیا تھا کہ قوم کے ہر طبقہ میں اور ہر عقیدہ اور خیال کے گروہ میں ان کی یکساں عزت تھی اور آخر وقت تک قایم رہی۔ امید ہے کہ ان کی شاندار زندگی کے شاندار کارنامے بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں صداقت و ایثار کے ساتھ قومی بھلائی اور ملکی خدمت کا حوصلہ پیدا کریں گے۔

محمد امین زبیری۔ مارہروی

بھوپال ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء

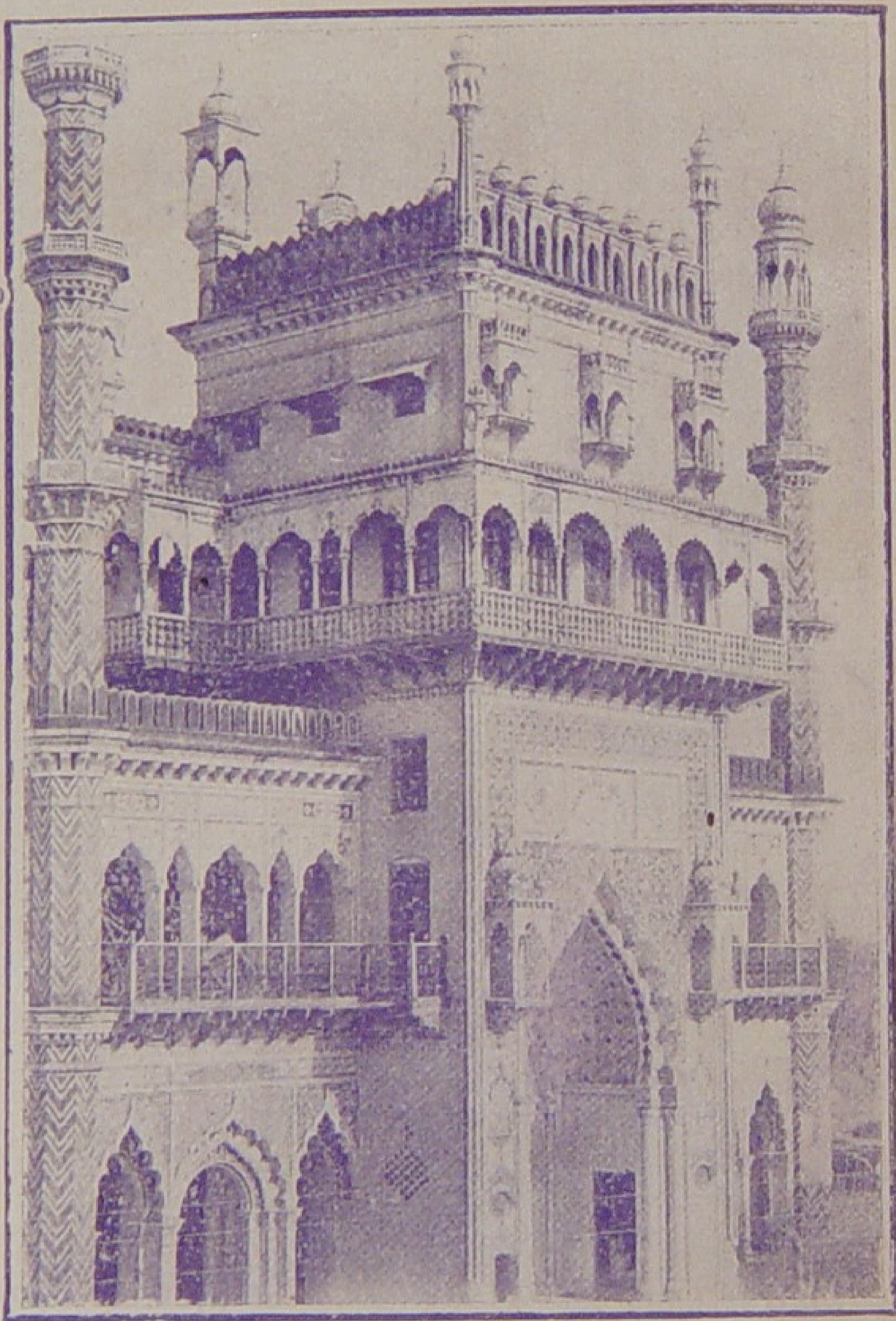
اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

علیگڈھ کے بعد اس صوبہ میں سب سے قدیم اور مشہور اسلامی مدرسہ ہے جہاں تعلیم ذہنی کے ساتھہ مذہبی اور جسمانی تربیت کا بھی بہترین انتظام ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ کے طلبا یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ دارالاقامہ میں متعدد قابل اُستاد اور علما، بچوں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے اُن کے ساتھہ رہتے ہیں۔ مفصل حالات کے لئے دستورالعمل طلب فرمائیے۔

محمد الطاف حسین بی اے (علیگ)

ہیڈ ماسٹر

بشیر پاشا سیریز



تذکرہ

شمس العلما حافظ نذیر احمد مرحوم

مرتبہ

محمد مہدی

اسلامیہ ہائی اسکول (اٹاوہ)



تعنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جواں مرگ بشیر پاشا
مرحوم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کے نام معنون کرتا ہوں جس کی زندگی
اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے
تکمیل تعلیم کر کے اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے
وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

نوجوانان قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے ان مشاہیر قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

عظیم الرجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بکثرت شائع کئے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں ان کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں چنانچہ اسوقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں ان عزیزوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالی ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔

میں اپنے پرجوش نوجوان دوست سید عبد الجلیل صاحب کا جو بمبئی میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں ان کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کریں گے

بسم الرحمن الرحیم

تذکرہ

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد خان ایل۔ایل۔ڈی۔ڈی
او۔ایل۔دہلوی مرحوم ومغفور

مولانا نذیر احمد دہلوی ایک ایسا نام ہے جس کے لیتے ہی ایک ایسی شاندار ہستی ذہن میں آتی ہے جو اُن مشاہیر اور نامور بزرگوں کی صف میں امتیازی کرسی پر متمکن ہے جنہوں نے اس آخری عہد میں خاک ہند سے مسلمانوں میں جنم لیا اور جب تک اردو زندہ ہے یا نام ہمیشہ ایک رفیع القدر، باکمال نامور کی یاد دلاتا رہے گا۔

مرحوم عربی علم ادب کے فاضل یگانہ عصر اور جدید اردو کے ایک رکن اعلیٰ اور اس بے مایہ زبان کو اپنی گرانقدر تصنیفات سے

سب سے زیادہ قادر الکلام تھے لغات ومحاورات اور ضرب الامثال اردو پر
جو عبور مولانا مرحوم کو حاصل تھا وہ آپ کے ہم عصر مصنفین و اہل قلم میں سے
کسی کو حاصل نہ تھا اگر الفاظِ کثیر کا استعمال استادی کی دلیل ہے۔
تو مصنفین اردو میں اس وقت تک مولانا مرحوم کا ہم رتبہ پیدا نہیں ہوا
مولانا مرحوم کی تصانیف کو جو حسن قبول حاصل ہوا اس سے بھی دوسرے
ہم عصر مصنفین کی تصانیف باوجود اپنی گراں پائگی کے محروم رہیں۔

سبب اس کا یہ ہے کہ مولانا کی تصانیف میں جو لطف و اثر ہے اور جو
افادۂ عام کی خصوصیت ہے وہ اِن کے ہمعصروں کی تصانیف میں
نہیں، مولانا کی قریباً کل تصانیف آج تک گھروں میں پڑھی جاتی ہیں
اور بعض کتابیں بطور استفادہ مطالعہ کی جاتی ہیں۔ اپنے ہمعصروں سے
مولانا مرحوم یہ شان امتیاز بھی رکھتے تھے کہ آپ کی بعض تصانیف
گورنمنٹ سے معقول صلہ کی مستحق قرار پائیں۔

مولانا جس پایہ کے مصنف تھے اس سے فائق تر لیکچرار تھے مسٹر مورسین کا
قول تھا کہ، صدہا برس تک یورپ ایسا اسپیکر پیدا نہیں کرسکتا"

انہیں علمی فضائل نے مولانا کو حکومت ہند سے شمس العلما ایڈنبرا
یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ڈی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی" او،

مسند تعظیم و تکریم پر بٹھاتی ہیں مولانا مرحوم قوم کے ہمدرد اور بہی خواہ بھی تھے آخر عمر تک آپ کا مشغلہ زندگی قوم کی دینی و دنیاوی خدمات رہا۔

خدا نے مولانا کو علم و فضل کی بے بہا دولت کے ساتھ دولت دنیا سے بھی مالا مال کیا تھا، یہ سب کچھ مولانا کی ذاتی سعی و کوشش عقل و تدبیر یا ان استعدادوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا جو خدا نے مولانا کی ذات میں ودیعت فرمائی تھیں دوسرے الفاظ میں خدا کی شکر گذاری کا نتیجہ تھا غرض کہ مولانا کی زندگی آئندہ نسلوں کے لئے نہ صرف ایک "اچھی مثال" بلکہ ایک سبق ہے۔

ولادت، خاندان، طالب العلمی، شادی

مولانا نذیر احمد ۱۸۳۱ء میں بجنور کے ایک گاؤں رہڑ میں پیدا ہوئے والد کا نام سید سعادت علی تھا مولانا کا سلسلۂ نسب نو واسطوں سے شاہ عبد الغفور اعظم پوری تک پہنچتا ہے جو شاہ عبد القدوس گنگوہی کے خلفا میں سے ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔

مولانا نذیر احمد مرحوم نے ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد ہی سے پائی اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا، ابھی تعلیم ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ان کے والد نے دہلی بلا لیا یہاں

ایک ایسے مولوی صاحب کے سپرد کیے گئے جو تعلیم برائے نام دیتے تھے اور گھر کا کام زیادہ لیتے تھے دہلی میں جس جگہ اس وقت ریلوے اسٹیشن ہے، یہاں پہلے پنجابی کٹرہ تھا اس کٹرہ کی مسجد میں مولوی محمد عبدالخالق صاحب حدیث کا درس دیا کرتے تھے یہی مسجد طلبا کا دارالاقامہ تھی قریباً سنہ ۴۵ء میں مولانا نذیر احمد مرحوم اس مسجد میں داخل ہو گئے یہ زمانہ مولانا کا نہایت افلاس و مصیبت کا تھا لیکن شوقِ علم اس سخت مشکل پر غالب آ گیا۔

اسی زمانہ میں مولوی عبدالخالق صاحب نے اپنی پوتی کی شادی کرنا چاہا درخواستیں تو بہت تھیں لیکن مولوی صاحب موصوف چاہتے تھے کہ جو شخص نماز کا پابند معاملہ کا اچھا اور زبان کا سچا ہو اس سے شادی کی کی جائے گی اِن شرطوں میں مولانا نذیر احمد ہی پورے اُترے اس لئے قرعۂ فال انہیں کے نام نکلا اور شادی کر دی گئی شادی کے بعد بھی مولانا نذیر احمد بدستور مسجد کے طالب علم رہے، دیگر طلبا کی طرح مولانا کو بھی بتّی کے واسطے تھوڑی سی روئی اور تیل دیدیا جاتا تھا جس طالب علم کے پاس تیل زیادہ جلتا تھا وہی تعریف کا مستحق ہوتا تھا اس تعریف کے اہل مولانا ہی ثابت ہوتے تھے کیونکہ اور سب طالب علم سو جاتے تھے اور تنہا مولانا چراغ کے آگے اپنا سبق یاد کرتے رہتے تھے۔

دہلی میں اس وقت مولوی مملوک علی دہلی کالج کے عربی پروفیسر

بڑی پایہ کے عالم تھے مولانا کے شوق علم نے تحریک کی کہ ایک سبق مولوی
مملوک علی کے یہاں شروع کیا جائے لیکن مولوی صاحب عدیم الفرصت تھے
اس لئے انہوں نے انکار کیا مولانا کے اصرار پر یہ کہا کہ اچھا جس وقت
ہم مدرسہ جایا کرتے ہیں اُس وقت آجایا کرو راستہ میں چلتے چلتے
جو کچھ پڑھ سکو گے پڑھا دیا کریں گے مولانا نے منظور کر لیا روزانہ جاتے
اور مولوی مملوک علی کی پینس کے ساتھ کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے دوڑتے
اور کالج تک جو کچھ پڑھ سکتے پڑھ لیتے کچھ روز کے بعد اپنے والد سے اجازت لیکر
جنہوں نے بمشکل اجازت دی دہلی کالج میں داخل ہو گئے درس نظامیہ کی
تکمیل کر چکے تھے کالج میں عربی علم ادب فلسفہ اور ریاضی کی تکمیل کی۔

کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر نے مولانا کی ذہانت وطباعی دیکھ کر چاہا کہ
یہ انگریزی پڑھ لیں اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ انگریزی کی ضرورت
بڑھتی جاتی ہے مولانا جیسے شایق بلکہ حریص علم کو تو کچھ عذر ہو ہی
نہیں سکتا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمانوں کے دلوں میں
انگریزی زبان سے انتہائی تعصب تھا مولانا کے والد انگریزی دانی پر
اپنے بیٹے کی موت کو ترجیح دیتے تھے اس لئے اُنہوں نے انگریزی
پڑھوانے سے قطعی انکار کر دیا مولانا مجبوراً علوم عربیہ ہی پڑھتے رہے
اور کالج کی سند تکمیل حاصل کر لی۔

ملازمت

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سرکاری ملازم ہو گئے بیس پچیس روپے ماہوار کے مدرس مقرر ہوے چونکہ مولانا ذہین ذی لیاقت اور محنتی تھے اس لئے بہت جلد ترقی کرلی،

سر رچرڈ ٹمپل نے گجرات (پنجاب) میں سلسلہ تعلیم قایم کرنے کو چھ شخصوں کا انتخاب کیا تھا انہیں میں ایک مولانا بھی تھے اور ان کو سو روپیہ ماہوار پر ضلع وزیٹری کا عہدہ ملا جسے اس زمانہ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کہتے ہیں ۵۷ء کے غدر میں مولانا گورنمنٹ کے خیر خواہ رہے اور اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان خطرے میں ڈال کر ایک میم کی جان بچائی اور کئی مہینہ تک اُسے گھر میں پناہ دیکر بحفاظت برٹش کیمپ میں پہنچا دیا اس خیر خواہی کے صلے میں گورنمنٹ کی طرف سے خوشنودی کا اظہار کیا گیا اور تمغہ وانعام عطا ہوا اور انسپکٹر مدارس کر کے آلہ اباد بھیجدیے گئے۔

یہاں ایک واقعہ پیش آیا جس نے مولانا کے دل میں تحصیل انگریزی کی زبر دست تحریک پیدا کر دی، واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کوئی عہدہ دار دفتر کے معائنہ کو آیا اور انگریزی میں گفتگو کرنے لگا۔ مولانا تو انگریزی جانتے نہ تھے

ان کا اسسٹنٹ جانتا تھا وہ انگریزی میں جواب دینے لگا مولانا کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسسٹنٹ سے کہا: تمکو میری موجودگی میں گفتگو کرنیکا کیا حق ہے، کیا تم کو اپنی انگریزی دانی پر کچھ گھمنڈ ہے! اچھا جبتک بقدر ضرورت انگریزی نہ پڑھ لوں گا مجھپر انگریزی ملازمت حرام ہے اسسٹنٹ نے ہر چند معذرت کی اور عہدہ دار نے بھی سمجھایا لیکن مولانا کی غیور طبیعت کو سکون نہ ہوا۔ اور زبردستی چھ مہینے کی رخصت لے کر تحصیل انگریزی میں ہمہ تن مشغول ہو گئے مولانا محنت و کوشش کے دھنی تھے جو کامیابی کی اصلی کنجی ہے چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں معمولی انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے لگے اس کے بعد اُنھوں نے انگریزی کا مطالعہ برابر جاری رکھا اور بہت اچھے انگریزی داں ہو گئے تقریر و تحریر بلکہ اچھی اچھی کتابیں بے تکلف سمجھ لیتے تھے مولانا اگرچہ انگریزی روانی اور بے ساختگی سے نہیں بول سکتے تھے تاہم جو بولتے تھے وہ صحیح اور اچھی انگریزی ہوتی تھی چنانچہ جن انگریز فاضلوں سے مولانا کو گفتگو کرنے کا موقع ملا اُنھوں نے اعتراف کیا کہ ڈپٹی صاحب انگریزی اچھی بول لیتے ہیں اس کامیابی میں مولانا کی ذہانت اور حافظہ کو بہت بڑا دخل ہے جو مولانا کو یہ دونوں قوتیں مبدء فیاض نے غیر معمولی عطا فرمائی تھیں۔

اسی انسپکٹری اسکول کے زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے

تعزیرات ہند، کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ شروع ہوا مولوی
کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ اس کام پر مامور ہوئے چونکہ سر ولیم میور
گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کو ترجمہ کی صحت کا بیحد خیال تھا اور سر ولیم
میور کو مولانا نذیر احمد کی زباندانی اور قابلیت کا علم تھا اس لیے مولانا
ترجمہ کی اصلاح و درستی اور درستی کے بعد سر ولیم میور کو سنانے پر
مامور ہوئے اس کام میں مولانا کو اپنا کمال ذہانت و قابلیت نمایاں
کرنے کا اچھا موقعہ ملا دونوں مولوی صاحبان ترجمہ کر کے پہلے مسٹر
کیمپسن ایم۔ اے ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم کے پاس بھیجتے تھے ڈائرکٹر
اس ترجمہ کو جو عربی فارسی خوب جانتا تھا اچھی طرح جانچ کر سر ولیم میور کے
پاس بھیج دیتا تھا مولانا نذیر احمد زبان اور اصطلاحات کی درستی کے بعد
سر ولیم میور کو سناتے تھے ایک روز کسی وجہ سے ڈاک نہیں آئی
مولانا کو فکر ہوئی کہ کل سنانے کو کچھ نہیں ہے اس لئے خود ہی اصل
کتاب اور ڈکشنری لے کر بیٹھ گئے اور گیارہ پیریگراف ترجمہ کر ڈالی
دوسرے دن جب سر ولیم میور نے ہر روز سے زیادہ پیریگراف دیکھی
پوچھا: اور دن تو چار پانچ ہی پیریگراف ہوتے تھے آج گیارہ کیوں
ہیں؟" مولانا نے کہا: کل ڈاک نہیں آئی، اس لئے میں نے خود ترجمہ
کر ڈالا جس قدر ترجمہ ہوا وہ پیش کر دیا۔" سر ولیم میور نے سنکر کہا:

"ہوں تو یہ ترجمہ تم نے کیا ہے اچھا جاؤ تم بھی مولوی عظمت اللہ کے ساتھ شریک ہو کر کام کرو اور بحث و تمحیض کے ساتھ ترجمہ کرو اصطلاحات کا ذرا زیادہ خیال رکھنا" یہ حکم پاکر مولانا بھی ترجمہ میں شریک ہو گئے اور نہایت کدو کاوش سے ترجمہ کیا اور قانونی اصطلاحیں وضع کیں جن کا اس وقت تک اردو میں وجود ہی نہ تھا آج جو قانونی اصطلاحیں مقبول خاص و عام ہیں مثلاً خیانت مجرمانہ، ازالہ حیثیت عرفی، اقدام جرم ارتکابِ جرم، استحصال بالجبر، قتلِ عمد، حبس بیجا وغیرہ وغیرہ سب مولانا نذیر احمد ہی کی ذہانت وطباعی کا نمونہ ہیں، یہ ایسی موزوں و مناسب اصطلاحیں ہیں کہ ان سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتیں اور تعزیرات کا ترجمہ بھی اس قدر مکمل ہے کہ کہیں ایک لفظ کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے،

جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو سر ولیم میور نے تینوں مترجموں کو چھ چھ سو روپے کی قیمتی ایک ایک گھڑی انعام میں دی اور ڈپٹی کلکٹری کا وعدہ کر کے امیدواروں میں نام درج کرلیا۔

مولانا نذیر احمد پہلے تحصیلدار ہوئے پھر چند روز کے بعد ڈپٹی کلکٹر بندوبست اس کے بعد ڈپٹی کلکٹری ضلع پر فائز کئے گئے قانون اسٹامپ اور قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ بھی مولانا نذیر احمد ہی نے کیا تھا۔

ملازمت حیدر آباد

جس طرح تعزیرات ہند کا ترجمہ مولانا کی ترقی کا سبب ہوا اسی طرح
علم ہیئت کی ایک کتاب "گولمینز ہیون" کا ترجمہ ترقی کا باعث ہوا یہ
کتاب ریزیڈنٹ کشمیر نے لکھی تھی جو غالباً مولانا کا شاگرد تھا اس نے
اس کتاب کے بہترین ترجمہ کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام اشتہار دیا
مولانا کو بھی ترجمہ کے لئے لکھا مولانا نذیر احمد نے کمال محنت و جان کاہی سے
ترجمہ کیا اور لوگوں نے بھی ترجمہ کیا تھا اس لئے بہترین ترجمہ کے
انتخاب کے لئے دہلی میں ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ایک ممبر سید
مرحوم بھی تھے کمیٹی نے مولانا ہی کا ترجمہ انتخاب کیا لیکن بعض ممبروں نے
یہ رائے بھی لکھی کہ گو موجودہ ترجموں سے یہ سب سے بہتر ہے۔ لیکن قابل تعریف
یہ بھی نہیں ہے اس لئے رزیڈنٹ کشمیر نے بجائے ایک ہزار کے صرف
پانچسو روپیہ انعام کا دیا اور ترجمہ سرسالار جنگ کو حیدر آباد بھیجا کہ نظام
سابق کے نانا امیر کبیر سے درستی کرادی جائے جو علم ہیئت کی بہت بڑے
ماہر تھے امیر کبیر نے ترجمہ دیکھ کر لکھا کہ: وہی شخص خوب اصلاح
و نظر ثانی کر سکتا ہے جس نے ترجمہ کیا ہے' بالآخر ترجمہ پھر مولانا کے
پاس آگیا مولانا نے کچھ ردو بدل کر کے بقیہ پانسو طلب کیے اس اثنا میں

رزیڈنٹ کشمیر کا انتقال ہو گیا بعد میں اس کی میم نے وہ روپیہ بھیجدیا۔

حیدر آباد میں جب سر سالار جنگ مرحوم نے ترجمہ کے متعلق امیر کبیر کی رائے سنی تو وہ لائق لوگوں کی تلاش ہی میں رہتے تھے فوراً انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ: مولانا نذیر احمد کی خدمات کچھ عرصہ کیلئے مستعار دیدی جائیں" گورنمنٹ نے منظور کر لیا اور مولانا آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ پر حیدر آباد چلے گئے وہاں پہلے بندوبست پر مامور ہوے اسی زمانہ میں اُنھوں نے قرآن شریف حفظ کیا عربی علم ادب سے مولانا کو خاص ذوق تھا اسی ذوق نے اِن کو حافظ قرآن کر دیا یہاں اکثر دورے پر رہنا ہوتا تھا اور بعض وقت کوئی کام نہ ہوتا تھا اس بیکاری کی زمانہ میں قرآن شریف یاد کیا کرتے تھے آخر پورا قرآن یاد ہو گیا حیرت کی قابل یہ بات ہی کہ یہ نعمت عظمےٰ مولانا کی صرف چھ مہینے کی محنت کا ثمرہ ہے۔

میعاد ختم ہونے کے بعد مولانا نذیر احمد نے استعفا لکھکر پیش کیا لیکن سر سالار جنگ مرحوم نے منظور نہ کیا مولانا نے اپنے اقربا اور اعزہ سے لئے کچھ مراعات کی درخواست کی سر سالار جنگ مرحوم نے اِن کے نابالغ لڑکے کا دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور چند لواحقین کو معقول ملازمت عطا کی اب مولانا نذیر احمد مستقل طور پر حیدر آباد میں ملازم ہو گئے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت چھوڑ دی

یہاں مولانا برابر ترقی کرتے رہے اور ۱۷۰۰ روپیہ ماہوار تنخواہ پر آخر میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے

سالار جنگ کو نظام دکن کی تعلیم کے لئے ایک نصاب مرتب کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی اس کام کے لئے مولانا ہی پر نظر انتخاب پڑی چنانچہ نصاب کی تیاری اِن کے سپرد کی گئی اُنھوں نے نہایت قابلیت سے یہ کام انجام دیا اور سات رسالے مرتب کئے جو مال، فوجداری، عدالت وغیرہ شعبہائے سلطنت کے اصول و قواعد پر تھے افسوس ہے کہ یہ رسالے حلیۂ طبع سے آراستہ نہ ہوے ورنہ رؤسا اور عام شائقین کے لئے بھی بہت مفید ہوتے۔

سالار جنگ مرحوم مولانا کی قابلیتوں کے بیحد معترف تھے اسی لئے اُنھوں نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو مولانا کے پاس پڑھنے بٹھایا لائق علی خاں کے رفیق درس راجہ کشن پرشاد تھے اس لئے یہ دونوں مولانا کے گھر سبق لینے آیا کرتے تھے۔

جب لائق علیخاں جوان ہوگئے اور سالار جنگ کا انتقال ہوگیا تو یہ عہدۂ وزارت پر باپ کے جانشین ہوے سالار جنگ ثانی ان کا خطاب ہوا۔ اِن کے جو ہمنشین تھے وہ مولانا کی طرف سے کھٹکتے تھے کہ

اسی غلط خیال کی بنا پر موقع کی تاک میں رہتے تھے ایک روز سالار جنگ ثانی نے مولانا سے کچھ بے تکلف باتیں کیں مولانا نے بھی چند کلمات نصیحت کہدیے ندیمانِ سالار جنگ ثانی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مولانا کی طرف سے خوب کان بھر دیے اس وقت سے مولانا کی طرف سے اِن کے تیور بدل گئے مولانا نے جو یہ رنگ دیکھا تو پنشن لے کر دہلی چلے آئے۔

تصنیف و تالیف

دہلی آکر مولانا تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے اس سے پہلے زمانہ ملازمت میں بھی مولانا کا مشغلہ تصنیف و تالیف رہا صرف زمانہ ملازمت حیدر آباد میں بجز نظام دکن کی تعلیم کے لئے سات رسالوں کے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ سب سے پہلے "چند پند" اور "حکایات" لکھیں یہ دونوں کتابیں نصائح اور اخلاق پر ہیں اسکے بعد منطق میں ایک کتاب مبادی حکمت" تالیف کی اس میں مسائل منطق ایسے دلکش انداز سے لکھے ہیں کہ اس خشک علم کے مسائل سمجھنے میں نہ کچھ دقت ہوتی ہے نہ طبیعت گرانی محسوس کرتی ہے اس کتاب پر مولانا کو گورنمنٹ سے پانسو روپیہ انعام ملا تھا۔

اس کے بعد عربی صرف و نحو پر ایک رسالہ "ما یغنیک فی الصرف" تالیف کیا اور ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں لڑکیوں کے لئے امور خانہ داری سلیقہ شعاری اور تہذیب و شائستگی کی تعلیم کے لئے ایک کتاب "مراۃ العروس" تصنیف کی، یہ کتاب مولانا کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے اس میں عورتوں کی زبان اور اِن کے خیالات اس خوبی سے ادا کئے ہیں کہ عورتیں بھی اس سے بہتر نہیں کر سکتیں یہ کتاب مقبول بھی خوب ہوئی ہندوستانی صوبوں کی کئی گورنمنٹوں نے نہایت قدر کی اور ممالک مغربی و شمالی کی گورنمنٹ نے اس کی ایک ہزار جلدیں خریدیں اور ایک ہزار روپیہ مولانا کو انعام دیا اور سر ولیم میور نے ایک سونے کی گھڑی اپنے پاس سے انعام دی۔ ہندوستان کے مختلف مطابع نے بطور خود یہ کتاب چھاپی اور فروخت کر کے خوب نفع کمایا۔ مسلمان شریفوں کے گھروں میں یہ کتاب آنکھوں پر رکھی گئی یہ کتاب پڑھی لکھی خواتین خود ذوق و دلچسپی سے پڑھتی تھیں اور بے لکھی پڑھی دوسروں سے پڑھوا کر سنتی تھیں اور آج تک مسلمانوں میں کوئی پڑھا لکھا گھر ایسا نہیں ہے جہاں یہ کتاب موجود نہ ہو یا مطالعہ نہ کیا جاتا ہو اور ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے کہ جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو

اسی پایہ کی دوسری تصنیف مولانا کی بنات النعش ہے اس میں علمی مسائل آسان اور عام فہم عبارت میں لکھے گئے ہیں زبان و طرزبیان وغیرہ سب مراۃ العروس کی طرح ہے اس کتاب پر بھی گورنمنٹ کیطرف سے انعام دیا گیا اور یہ بھی بہت مقبول ہوئی لیکن مراۃ العروس سے کچھ کم۔

تیسری معرکۃ الآرا تصنیف توبۃ النصوح ہے۔ اس کا موضوع خدا پرستی اور اولاد کی اخلاقی اصلاح ہے یہ کتاب بھی مراۃ العروس اور بنات النعش کی طرح خاص و عام میں مقبول ہوئی گورنمنٹ کی طرف سے اس کتاب پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا اس میں نصوح کا خواب کمال انشا پردازی اور ادب کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے یہ اسقدر زوردار دلچسپ اور پُر تاثیر ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواب ادب اردو کی لازوال چیزوں میں سب سے بلند جگہہ رکھنے کے قابل ہے۔

مولانا نے حیدرآباد سے آنے کے بعد سب سے پہلے "ابن الوقت" تصنیف کی جس میں دکھلایا ہے کہ ہندوستانیوں کے لئے انگریزی تمدن و معاشرت موزوں نہیں ہے اور اس کے اختیار کرنے میں کس قدر دشواریاں اور خرابیاں ہیں۔ اس کتاب کی طرز بھی

قصہ کی ہے جس کی داغ بیل خود مولانا کے واقعاتِ زندگی ہیں۔
ایک مولوی صاحب جنہوں نے مولانا سے ادب عربی پڑھا تھا بیان کرتے تھے کہ، ایک مرتبہ مولانا نذیر احمد صاحب نے اپنی تصنیف "ابن الوقت" دیکھنے کو مرحمت فرمائی میں جب اول سے آخر تک دیکھ چکا تھا، تو پوچھا جانتے ہو یہ "ابن الوقت" کون ہے میں نے کہا میں نہیں جانتا کہا "میں ہوں" پھر اُنھوں نے تفصیل کے ساتھ کل واقعات بیان فرمائے "معارف مرحوم علی گڈھ میں مولانا کا ایک مضمون چھپا تھا جس میں اُنھوں نے اپنے واقعات زندگی خصوصاً مذہبی تشکوک و ترددات کا دور تفصیل سے دکھلایا ہے اس مضمون کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابن الوقت کا خلاصہ ہے۔
ابن الوقت کے بعد مولانا کی انہیں مذکورۂ بالا کتابوں کی طرز پر تین کتابیں اور شائع ہوئیں ایک "محصنات" جس میں کثرت ازدواج کے قبائح اور اس کے بدنتائج پر بحث کی گئی ہے دوسری "ایامیٰ" جس میں بیواؤں کی دردناک حالت موثر طریقہ سے دکھلائی ہے اس کتاب نے بہت مفید کام کیا کہ عقد بیوگان کو معیوب سمجھنے کا خیال یا تو دور کر دیا یا اس عقیدے کو متنزلزل کر دیا اور بعض جگہہ تو بیواؤں کا نکاح کرا دیا۔ تیسری کتاب "رویائے صادقہ" ہے اصل میں یہ

اس کا موضوع عقل و نقل میں تطبیق ہے لیکن شروع میں صادقہ کے
حالات جو سچے خواب دیکھا کرتی تھی بہت دلچسپ ہیں خصوصاً
وہ بحث بہت پر لطف ہے جس میں ایک صاحب یورپین و یوروپین
لیڈی کے ساتھ شادی کے دلدادہ ہیں دوسرے اپنی قوم و ملک
کی عورت سے شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا کتابیں معاشرت و اخلاق کی اصلاح کا سبق
دیتی ہیں اور اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت موثر و نتیجہ خیز ہیں
اس لئے ان کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ ان میں علاوہ خوبیٔ زبان اور
لطف بیان کے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ باوجودیکہ حسن و عشق کی
چاشنی سے خالی ہیں لیکن دلکشی اور دلچسپی میں عاشقانہ ناولوں سے
کم نہیں ہیں۔ ہر کتاب شروع سے آخر تک پڑھنے والے کے لطف
و دلبستگی کو قایم رکھتی ہے انہیں کتابوں نے مولانا کو اپنے بعض
ہمعصر مولفین سے ممتاز بنا دیا ہے۔ کیونکہ ان میں کتب خانوں سے مدد نہیں
لی گئی ہے بلکہ ان کا ماخذ غیر محدود واقعات زندگی ہیں ان میں سے اپنے
موضوع کے مناسب واقعات لیکر خوبی و خوش اسلوبی اور پر تاثیر طریقہ سے
ترتیب دیے گئے ہیں اور اردو میں ان کتابوں نے اخلاقی افسانہ نویسی
کی نئی طرز کی بنیاد ڈالی ہے

افسوس ہے کہ ان بے بہا کتابوں کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے حالانکہ یہ کتابیں بھلا دینے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ہر اردو خواں مرد و عورت کو ان کا مطالعہ بہت ضروری ہے اردو زباندانی کے لیئے تو کوئی شخص مولانا کی کل تصانیف سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

صرف صغیر، رسم الخط، موعظہ حسنہ، افسانۂ غدر اور نصاب خسرو بھی مولانا کی مفید تصانیف ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھیں سب سے بڑا کارنامہ ان کا ترجمہ قرآن مجید ہے یہ ۱۸۹۳ء سے شروع ہوا اور ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس سے قبل شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم کا ترجمہ مقبول ہو چکا تھا جو اس زمانہ کی اردو کے اعتبار سے بہترین ترجمہ ہے اس کی خاص خوبی جو مشہور ہے وہ یہ ہے کہ محتمل المعنی عربی الفاظ کا ترجمہ محتمل المعنی اردو الفاظ میں کیا ہے تاہم شاہ صاحب مرحوم کے وقت سے زبانِ اردو نے بہت ترقی کر لی تھی ضرورت تھی کہ ایک نہایت فصیح و بلیغ اور معنی خیز ترجمہ کیا جائے مولانا نذیر احمد مرحوم سے بہتر اس کام کو دوسرا شخص نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مولانا عربی علم ادب کے فاضل اجل اور زبانِ اردو کے باکمال اور قادر الکلام انشا پرداز تھے چنانچہ مولانا نے ترجمہ کیا اور اس میں شک نہیں کہ خوب کیا یہ ایسا شستہ اور رفتہ شگفتہ بامحاورہ اور فصیح و بلیغ ترجمہ ہے کہ اس سے

بہتر نہیں ہو سکتا لیکن مولانا مرحوم نے ترجمہ کو اپنے لب و لہجہ کے سانچہ
میں ڈھال کر اردو محاورات بلاضرورت کھپائے ہیں اس کے علاوہ قوسین کے
اندر چھوٹے اور بڑے جملوں کا اس قدر اضافہ کیا ہے کہ نرا ترجمہ نہیں رہا
بلکہ تفسیر ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ ترجمہ بھی قرآن مجید کے دیگر
تمام ترجموں کی طرح معتقداتِ عوام کے مطابق کیا گیا ہے اور جس طرح
دوسرے کل ترجمے روایات اور تفسیری حکایات کو پیشِ نظر رکھکر کیے گئے
ہیں۔ اس نقص سے یہ ترجمہ بھی پاک نہیں ہے حالانکہ قرآن شریف
سب احادیث و روایات وغیرہ کا معیار ہے اس کی حقیقی عزت و احترام
اور ادب و تعظیم یہ ہے کہ اس کا ترجمہ معتقدات عوام و خواص حدیث
و روایت اور بڑے سے بڑے مفسر کی رائے و خیال سے خالی الذہن
ہو کر کرنا چاہیئے اور صرف لغت و محاورات عرب اور خود قرآنِ مجید
مرکوزِ خاطر رہنا چاہیئے غرض کہ ایک محققانہ ترجمے کی ضرورت علیٰ
حالہ قایم ہے مولانا کے ترجمہ میں بعض آیات کا ترجمہ اور حواشی خود
ان کے عقیدے کے خلاف ہیں اگرچہ مولانا کا یہ عذر تھا کہ چند
مسائل کی وجہ سے عوام کو بھڑکانا نہیں چاہیئے بڑی ضرورت
اس بات کی ہے کہ لوگ قرآن کا ترجمہ پڑھیں۔ یہ عذر ایک حد تک

ان کی اشاعت کہاں جائز ہوسکتی ہے؟ تاہم باوصف ان نقائص کے
اور باوجود ایک طبقہ علما کی مخالفت کے۔ مولانا کا ترجمہ قرآن مجید
قبول ہوا آج تک ایک درجن سے زیادہ طباعتیں ہوچکی ہیں اور
یہ اسی ترجمہ کی برکت ہے کہ جو لوگ قرآن کا نام ہی نہیں لیتے تھے
وہ تلاوت کرتے ہیں یا کم سے کم مولانا کے نام اور ان کی ادبیت نے
قرآن شریف لوگوں کے ہاتوں تک پہنچا دیا۔

مولانا کی آخری زندگی دینی خدمات کے لئے وقف ہوچکی
تھی اور وہ ہمہ تن مذہبی تصنیفات ہی میں مشغول رہا کرتے تھے ترجمہ
قرآن مجید کے بعد انہوں نے ادعیۃ القرآن اور دہ سورہ اور الحقوق
والفرائض مرتب کیں آخری کتاب مولانا کی زبردست تالیف ہے
اسلامی معتقدات اخلاق واعمال پر ایسی مبسوط کتاب اردو میں
آج تک نہیں لکھی گئی اس میں پہلے ہر مضمون کی آیات قرآنی
واحادیث مع ترجمہ لکھی ہیں اس کے بعد اس مضمون کی تشریح
وتفصیل ہے ضمناً ہر قسم کے فقہی مسائل بھی ہیں غرض کہ یہ کتاب
پیدائش سے وفات تک تمام مسائل کی جامع ہے پھر زبان کی
خوبی اور عبارت کی دل آویزی وہی ہے جو مولانا کی دیگر تصنیفات
کی خصوصیت مشترک ہے بلحاظ افادہ اس کتاب کو مولانا کی

تمام کتابوں پر برتری حاصل ہے جسکو اس کتاب کے مضامین مستحضر

ہوں وہ اچھا خاصا مولوی بن سکتا ہے عام شائقین بطور استفادہ

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور مولفین کے لیے بہت کتابوں کا

ماخذ ہو سکتی ہے بلکہ ہو رہی ہے اس کتاب کے علاوہ ایک تصنیف

مولانا کی اجتہاد بھی ہے جس میں حقانیت اسلام عقلی دلائل سے

لیکن اپنے عام دلپذیر انداز تحریر میں ثابت کی ہے۔

احمد شاہ سائق عیسائی نے ایک کتاب امہات المومنین لکھی تھی

جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت دریدہ دہنی سے

اعتراضات کئے ہیں اس کا جواب سر سید مرحوم نے بھی لکھا تھا لیکن وہ

ناتمام رہا مولانا نذیر احمد نے بھی امہات الامۃ ایک معرکۃ الآرا کتاب

لکھی جو امہات المومنین کا نہایت دنداں شکن جواب ہے علامہ سید علی

بلگرامی مرحوم چاہتے تھے کہ یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپ کے

سامنے پیش کی جائے لیکن مولانا کے قلم سے بعض شوخ جملے نکل گئے تھے

مولوی تو مولانا کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھے تھے ان کو شور برپا

کرنے کا اچھا موقع مل گیا پر کا کوا اور رائی کا پہاڑ بنا کر کھڑا کیا

مولانا پر کفر کے فتوے شائع کئے گئے جو اس قسم کے مولویوں کی

ایک ذلیل اور عامیانہ حرکت اور بزعم خود ایک مقدس کام ہے

مولانا نے کتاب کی اشاعت روک دی تھی اس پر صدہا علمار نے خط لکھے کہ آپ کتاب کی اشاعت ہرگز نہ روکیئے اور وکیلوں اور بیرسٹروں نے لکھا کہ اگر عدالت تک نوبت پہنچی تو ہم بلا محنتانہ پیروی کریں گے لیکن مولانا فساد پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انہوں نے بقیہ تمام جلدیں حکیم اجمل خاں صاحب کے حوالہ کردیں اور انجام یہ ہوا کہ وہ سب جلدیں آگ کی نذر کردی گئیں۔ اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن ترقی اردو نے بڑی خوبی سے لکھا ہے اس لئے ہم وہ عبارت نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

> بڑے اور نامور لوگوں پر اکثر اپنے ہمعصروں کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں مولاناؒ آخر عمر میں اس سے نہ بچے امہات الامۃ کا شائع ہونا تھا کہ دلیؔ میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے چلے بیٹھے تھے اِن کی بن آئی خوب جلے پھپولے پھوڑے۔ مخالفت میں رسالے چھپوائے طرح طرح کے بہتان باندھے کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی طرح طرح سے عوام کو بہکایا یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہوگئے اور میں نے سنا ہے

پر مستعد ہو بیٹھے یہ غدر دلی سے اُٹھا اور دوسرے مقامات تک پہنچا

لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے

کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلماء کا اجلاس دلی میں ہوا

اُس میں علمائے کرام تو موجود ہی تھے انہوں نے باہم مسکوٹ

کرکے امہاۃ الامۃ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد

شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کرکے ایک

صاحب کے پاس رکھوادی تھیں اور بکری موقوف کرادی تھی

منگوائیں اور اپنے سامنے اِن کتابوں کا ڈھیر لگوایا اور

اِن میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لئے

آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کرکے آگ لگادی آگ

شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہرے پر پڑ رہی تھی اور

اِن کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس

خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا

جو ایک خونخوار درندے یا سنگدل انسان کی صورت سے

انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو

مولانائے مرحوم بھی اسی آگ میں جھونک دیے جاتے یہ منظر

قابل دید تھا مولوی ... جاتے ... سط ... کی ... اور ... کی

یاد دلاتا تھا جنہوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ
زندہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیے کڑکڑاتے تیل کے
کڑاہوں میں ڈال دیے تھے گلے میں پتھر باندھ کر بہتے
دریاؤں میں ڈبو دیے۔ کتوں سے پھڑوا دیے اور طرح طرح کے
عذابِ دیگر اور عجیب و غریب شکنجوں میں کس کس کر مار ڈالے
اِن کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تو وہ عبرت تھا جو بیسویں
صدی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار رہتا یہ راکھ
اس قابل تھی کہ اُس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کی شیشیوں میں
بند کر کے رکھ لی جاتی تاکہ آئندہ نسلیں اسے سامنے رکھکر ان
علمائے کرام اور مصلحانِ ملک و ملت کی ارواحِ پاک پر فاتحہ
دلائیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں اس رات گویا
مولویوں نے شب برات منائی اور اُس آگ سے نفوس
مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمالناموں میں ایک ایسی نیکی کا
اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگی
یہ ان بزرگواروں کا کام ہے جنہوں نے چشم بد دور مسلمانوں کی
دینی و دنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے

کتاب کے مختلف [illegible] والوں کی فہرست میں شمس العلماء علامہ

شبلی نعمانی مصنف "کتب خانہ اسکندریہ" کا نام نامی بھی جلی حروف
میں لکھا ہوا ہے

اَنْتَ مِنْهُمْ یَا بُرُوطِس
فَآهًا ثُمَّ آهًا ثُمَّ آهًا

مولانا نذیر احمد مرحوم کی وفات کے بعد مولوی راشد الخیری نے یہ کتاب دہرے کے ساتھ چھپوا کر شائع کردی اب ہر شخص خرید سکتا اور اسکے مطالعہ سے مستفید ہو سکتا ہے۔

مولانا کی آخری تصنیف "مطالب القرآن تھی" جو افسوس ہے کہ ناتمام رہ گئی اس کتاب میں مضامین قرآنی کے باب قایم کرکے چھپوائے تھے اور ہر مضمون پر ایک تفسیری مضمون لکھا ایک چوتھائی کتاب لکھنے پائے تھے کہ پیام اجل آگیا۔ یہی ناتمام کتاب چھپ گئی ہے ابتدائً مولانا کی تصانیف جس مطبع نے چاہا چھاپیں اور جس قدر جلدیں چھاپیں وہ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں مولانا پہلے کتاب چھپوا کر کسی کتب فروش کو کمیشن پر دیدیا کرتے تھے آخر میں خود ایک مطبع قایم کرلیا تھا جس کا نام "شمسی پریس" تھا اسی میں قرآن شریف وغیرہ اور آخری تصانیف طبع ہوئیں۔

لیکچر اور نظم

۱۸۸۸ء تک مولانا کی شہرت بحیثیت ایک بلند پایہ مصنف کے رہی لوگوں کو یہ خبر نہ تھی کہ مولانا جس پایہ کے انشاپرداز ہیں اسی پایہ کے مقرر بھی ہیں سب سے پہلے دسمبر ۱۸۸۸ء کے اجلاس کانفرنس لاہور میں انکا لیکچر لوگوں نے سنا تو سب کو حیرت ہوئی پہلے ہی لیکچر میں ان کی ملکۂ تقریر کی دھاک بندھ گئی واعظوں کی طرح وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نہیں چیختے تھے بلکہ اِن کا انداز تقریر نہایت شاندار تھا، اِن کی آواز بلند اور بارعب تھی خاص کمال اِن کی تقریر کا یہ تھا کہ جلسے کو اپنے قابو میں رکھتے تھے اور بڑے سے بڑے شخص پر اِن کا اثر پڑتا تھا، سامعین کو ہنسا دینا اور رلا دینا اِن کے اختیار میں تھا جس وقت وہ تقریر کرتے تھے اس وقت لوگوں کی یہ حالت ہوتی تھی کہ کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اِن لکچروں میں انگریزی الفاظ بلکہ جملے کثرت سے ہوتے تھے جو انگریزی داں اصحاب کو ناگوار نہ معلوم ہوتے ہوں لیکن محض اردو خواں لوگوں کے لئے نامانوس اور ناخوشگوار تھے تاہم ان کا لیکچر بیحد دلچسپ ہوتا تھا کیونکہ اس میں ظرافت کی چاشنی کافی، زبان فصیح و بلیغ اور اردوے معلےٰ ہوتی تھی، مولانا کانفرنس،

انجمن حمایت الاسلام لاہور" اور طبیہ کانفرنس دہلی میں خاص طور پر مدعو کیے جاتے تھے جب لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ مولانا نذیر احمد کا لیکچر ہوگا تو خلقت ٹوٹ پڑتی تھی اور اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ پنڈال کے اندر اور باہر تل رکھنے کو جگہہ نہیں ملتی تھی اور مقررہ وقت سے پہلے لوگ آکر بیٹھ جایا کرتے تھے جب مولانا آتے تھے تو خوشی سے سارا پنڈال گونج اُٹھتا تھا۔ بعض وقت گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت لوگ دھوپ میں بیٹھے رہا کرتے تھے لیکن مولانا کی لیکچر سننے کا شوق تکلیف پر غالب آجاتا تھا اور سنتے وقت اِن کو اپنی تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا چندہ کی وصولی کے لئے جو لیکچر دیتے تھے اس میں لوگوں کی جیبیں خالی کرالیا کرتے تھے جلسہ سے پہلے مولانا اپنا لیکچر قلم بند کرکے یاد کرلیا کرتے تھے اور اکثر تو تقریر کرنے سے پہلے لکچر چھپوالیا کرتے تھے قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس میں قوسین کے اندر لفظ چیرز بھی ہوتا تھا اور عموماً اس موقع پر حاضرین جلسہ ضرور چیرز دیتے تھے۔ کیونکہ مولانا تقریر کے وقت تحریر کے پابند نہیں رہتے تھے اور تخئیل کی پرواز میں کہیں کے کہیں پہنچ جاتے تھے، زبان اور طبیعت کی روانی مرکز پر قائم نہیں رکھتی تھی تاہم مولانا مبحث سے دور نہیں جاتے تھے اور پھر

اصل نقطہ پر واپس آجاتے تھے۔

مولانا کے لیکچروں کا مجموعہ چھپا ہوا ملتا ہے شائقین زبانِ اردو کو اس کا مطالعہ بالیقین مفید ہے۔

مولانا اگرچہ شاعر نہ تھے نہ شاعری اِن کا پیشہ تھا۔ لیکن طبیعت میں روانی تھی اردو کے قادر الکلام ادیب عربی کے فاضل اور جیّد عالم تھے اس لئے شعر کہنا اِن کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہ تھا تفنن طبع کے طور پر کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ سب سے بڑی نظم اِن کی ایک مسدس ہے، جو فسانۂ مبتلا" کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کی ہے محمڈن کانفرنس کے چوتھے اجلاس سے لکچر کے پہلے ایک نظم بھی لکھتے تھے اِن کی نظم پڑھنے کا انداز ایسا اچھا تھا کہ سامعین بہت محظوظ ہوتے تھے گو خود پڑھنے میں اس قدر لطف اندوز نہ ہوسکیں مولانا کی نظموں کا ایک مجموعہ نظم بے نظیر کے نام سے شائع ہوچکا ہے اس کے مطالعہ سے مولانا کی قادر الکلامی اور ذہانت وطباعی ضرور ثابت ہوتی ہے نظم میں جو خوبیاں ہونا چاہئیں مثلاً ترکیب وبندش کی چستی وغیرہ وہ سب موجود ہیں اگرچہ روح شاعری نہیں ہے لیکن بعض بعض اشعار میں یہ روح بھی پائی جاتی ہے اِن نظموں کے بعض مقامات پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مولانا

ہندوستانی شاعری سے آزاد ہیں اور کہیں کہیں غیر مانوس الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں یہ اعتراض صحیح ہو لیکن جبکہ پیشہ ور شاعروں کا کلام بھی ان نقائص سے پاک نہیں دیکھا جاتا تو مولانا جن کا پیشہ اور مشغلہ خاص شاعری نہ تھا معذور رکھے جا سکتے ہیں تاہم مولانا کی نظمیں فی الجملہ لطف سے خالی نہیں ہیں اور ناظرین کم و بیش دلچسپی حاصل کر سکتے ہیں۔

خطابات

مولانا کو علمی کارناموں اور اردو کی خدمات کے صلہ میں وقتاً فوقتاً گورنمنٹ اور یونیورسٹیوں کی طرف سے خطابات ملے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے ۲۔ اپریل ۱۹۰۲ء کو "ایل، ایل، ڈی" کی سند عطا ہوئی۔ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پنجاب یونیورسٹی کی پینتیسویں اجلاس کانووکیشن میں "ڈی، او، ایل" کی ڈگری دی گئی، لفٹنٹ گورنر پنجاب نے جو صدر جلسہ تھے ڈگری دیتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی:-

"تعمیل رزولیشن سینٹ جو ابھی پڑھا گیا اور نیز ان اختیارات

کی رو سے جو بحیثیت چینسلر یونیورسٹی مجھے حاصل
ہیں میں مولوی حافظ نذیر احمد خان
شمس العلما، ایل، ایل، ڈی کو ڈگری
اورنٹیل لرنگ میں شامل کرتا ہوں اور جس کے لیئے میں حکم
دیتا ہوں کہ یہ سند صاحب موصوف کو دیجاے - اور
میں صاحب موصوف کو مجاز کرتا ہوں کہ اس ڈگری کی متعلق
جو لباس مقرر ہے اُس کو زیب تن کریں میرے لیئے یہ وقت
خاص امتنان کا ہے کہ میں ایسے موقع پر بحیثیت ایک
چینسلر کے صدر نشین ہوں جب کہ یونی ورسٹی کی تاریخ میں
ایک تھوڑا سا جدید طرز عمل اختیار کیا گیا ہے یعنی یہ کہ
ڈاکٹر آف اورنٹیل لرنگ کی اعزازی ڈگری ایک ایسے
شخص کو دی گئے ہے جو نہ یونیورسٹی کا ممبر ہے نہ وہ
اس یونیورسٹی کا کوئی بڑا عہدہ دار ہے با این ہمہ میں
خیال کرتا ہوں کہ یہ کانووکیشن اس امر پر متفق ہوگا کہ اس سے
بہتر اور کوئی انتخاب اس معزز ڈگری کے ادا کرنیکا مولوی
صاحب موصوف کے سوا نہیں ہو سکتا مجھے کامل یقین ہے

کسی اور شخص نے اتنی کوشش کی ہو، اِن کی تصانیف کا حال آپ کو معلوم ہے اور مجھے یقین ہے کہ بالائی حصہ ہند میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ وہ بہترین کتابیں ہیں جو زبانِ اردو میں لکھی گئی ہیں مجھے مسّرت ہے کہ یہ عزت ایسے وقت میں دیجا رہی ہے جبکہ مَیں چانسلر ہوں مگر مجھے افسوس ہے تو صرف اس امر کا ہے کہ مولوی صاحب موصوف بنفس نفیس ڈپلوما لینے کے لئے خود تشریف نہ لا سکے۔

دیگر حالات اخلاق و عادات اور وفات

دنیا میں ایسے خوش قسمت لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو علم و فضل میں یکتائے زمانہ ہوں اِن کا علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، کوئی کارنامہ ہو وہ شہرت و ناموری حاصل کر چکے ہوں اور صاحب دولت و ثروت ہوں، مولانا نذیر احمد میں یہ سب فضائل جمع تھے وہ ایک زبردست عالم تھے اِن کی تصانیف علمی و مذہبی اور بعض دوسری حیثیتوں سے بہت بڑا کارنامہ ہیں۔ وہ ہندوستان کے نامور مشاہیر میں سے ہیں اور دولت اِن کے گھر کی لونڈی تھی گورنمنٹ اور حیدر آباد سے اِن کو بیش قرار پنشن ملا کرتی تھی حیدر آباد سے واپس

آنے کے بعد انہوں نے تجارت شروع کی اور ابتداءً انہوں نے
اپنے روپے سے پرامیسری نوٹ خرید لئے تھے کیونکہ وہ اِن نوٹوں
اور بینک کے سود کو جائز سمجھتے تھے لیکن بعض وقت اِن کے دل میں
خلش پیدا ہو جاتی تھی کہ آیا یہ جائز ہے یا ناجائز اس لئے انہوں نے
اپنا زیادہ روپیہ تجارت میں لگا دیا تھا اور رفتہ رفتہ کاروبار تجارت
بہت وسیع ہو گیا تھا مولانا کی تصانیف خود ایک چلتا مال تھیں ان سے
انہوں نے لاکھوں روپیہ پیدا کیا اور لکھ پتیوں میں اِن کا بھی شمار تھا
یہ فراہمی دولت نتیجہ تھی مولانا کی کفایت شعاری اور محنت وکوشش کی
مولانا کی کفایت شعاری جزرسی کی حد تک پہنچ گئی تھی کہ اپنے پوتے کو
ایک پیسے کے کھیلوں سے مہینا بھر تک بہلایا کرتے تھے لیکن اہل حاجت
کی امداد میں وہ نہایت فراخ دل تھے انہوں نے سینکڑوں بے روزگاروں کو
روپیہ دیکر روزگار سے لگایا اور اکثر بے روزگاروں کو نقدی سی امداد
کر کے باکار بنا دیا نادار طالب علموں کو معقول وظیفہ دیتے تھے اور
غریب مسلمان طلبا کی خفیہ امداد کرتے رہتے تھے۔ کئی طالب علموں کو
اپنے اخراجات سے انگریزی کی تعلیم دلائی دو کشمیری لڑکوں کو خود
پڑھایا اور اُن کے ساتھ ہمیشہ سلوک کرتے رہے جب وہ جوان ہو گئے

ایل ایل بی تک تعلیم دلوائی اور تمام مصارف تعلیم اپنے پاس سے ادا کئے
قومی کاموں میں ہمیشہ فیاضی سے چندہ دیا سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے
آنریری عربک پروفیسر تھے اس میں مالی امداد دیا کرتے تھے وفات سے
تھوڑا عرصہ پہلے پانسو روپیہ توسیع بورڈنگ کے لئے چندہ دیا تھا۔
سرسید مرحوم کے ہمیشہ دوست تھے محمڈن کالج علی گڈہ کے ابتدا سے
ٹرسٹی رہے کالج میں اکثر چندے دیے جب کالج کے روپے میں غبن ہوا
تو سب سے پہلے اُنہوں نے ایک ہزار روپیہ دیا اور تحریک کی کہ کالج پر جو
سترہ ہزار روپیہ بینک کا قرضہ ہوگیا ہے وہ خاص چندہ سے ادا کردیا جائے
اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی بھی امداد کرتے رہتے تھے اور اس کو ایک
گرانقدر رقم دینے کا بھی ارادہ تھا۔ سید کی تعلیمی تحریک کے بڑے حامیوں
میں تھے کانفرنس انجمن حمایت الاسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی کو آپ کے
لیکچروں کے ذریعہ بہت قیمتی مدد ملی جب چندہ کے لئے لیکچر دیتے تھے
تو سب سے پہلے خود معتد بہ رقم بطور چندہ پیش کرتے انہیں امدادوں کی
وجہ سے پنجاب میں آپ کا نام عزت سے لیا جاتا ہے ۱۹۰۴ء تک مولانا
برابر کانفرنس میں شرکت کرتے رہے لیکن مزاج میں شوخی اور کلام
میں گرمی تھی بعض جملے مولانا کی زبان سے ایسے نکل جاتے تھے جو لوگوں

جنہوں نے کانفرنس کی تکفیر کی تھی مولانا نے کچھ پھبتیاں اڑائی تھیں اس پر بعض عمائدین لکھنو کو جو کالج کے ہمدرد تھے ناگوار گذرا تھا اس لئے نواب محسن الملک مرحوم اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے محض معذرت کے طور پر مولانا کی تردید کی تھی یہ تردید مولانا کو ناگوار گذری اس لئے انہوں نے کانفرنس کی شرکت ترک کردی تھی لیکن کالج سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا تھا ۱۹۰۶ء میں اسٹرائک کے موقع پر مولانا کالج میں تشریف لے گئے تھے قومی کاموں سے بھی دست بردار نہیں ہوئے تھے آخر عمر میں اُن کا ارادہ تھا کہ ایک کثیر رقم کسی مفید قومی کام میں خرچ کریں لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اپنا ارادہ پورا نہ کرسکے ضرورت مندوں کے ساتھ سلوک برابر کرتے رہے جو شخص روپیہ قرض طلب کرتا اور چکنی چپڑی باتیں بناتا چونکہ مزاج بھولا واقع ہوا تھا مولانا صاحب اس لئے فوراً اعتماد کرلیتے تھے اور روپیہ دیدیتے تھے لیکن اِن کا دو ڈھائی لاکھ روپیہ ڈوب گیا تو آخر میں محتاط ہوگئے تھے۔

مولانا کا امتیازی وصف علمی فیض رسانی تھا انہوں نے اپنی گرانقدر تصانیف سے جو قوم کو گراں بار احسان کیا اس کے علاوہ آپ پنجاب یونیورسٹی اور حیدرآباد کے اعلی امتحانات کے ممتحن تھے اور طلبا کو تعلیم بھی دیا کرتے تھے جب سے مولانا حیدرآباد سے آئے

اسی وقت سے تعلم وتعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا روزانہ صبح کو حدیث اور علم ادب کا
درس دیا کرتے مولانا عربی ادب کے والہ و شیدا تھے اس لیئے اس کا سبق
بڑے شوق سے پڑہاتے تھے سینکڑوں طالب علم مولانا کے شاگرد ہیں جن
میں سے بعض جید عالم ہیں۔ اس مشغلہ سے ان کو اس قدر دلبستگی تھی
کہ ذرا فرق ڈالنا پسند نہ کرتے تھے ایک مرتبہ آپ کو حاکم ضلع کی طرف سے
آنریری مجسٹریٹی پیش کی گئی آپ نے یہ جواب لکھ دیا کہ مجھے گورنمنٹ سے
ہمیشہ اپنی خدمات کا صلہ ملا ہے اور اب تک ملازمت سے علیحدگی کے بعد
پنشن مل رہی ہے نہیں معلوم بلا معاوضہ لوگ کس طرح کام کرتے ہونگے
اسکے علاوہ یہ میری تعلیم وتعلم اور تالیف وتصنیف کے اوقات ہیں
میں ایسا اعزاز نہیں چاہتا جس سے میرے ان بیش بہا کاموں میں
فرق پڑے۔ لہذا شکریے کے ساتھ میں اس اعزاز کو واپس
کرتا ہوں۔

درس دیتے وقت مولانا کے غیر معمولی حافظے اور تبحر کا پتہ چلتا تھا
عربی اشعار اور حدیث و قرآن شریف پر اسقدر عبور تھا کہ کوئی لفظ،
قرآن شریف کا کتاب میں آتا تو قرآن شریف کی آیتیں حدیثیں اور
عربی اشعار جن میں وہ لفظ ہے بے تکلف پڑھ دیا کرتے تھے
اسی طرح اردو اور فارسی کے محاورات ضرب الامثال و اشعار ہزاروں یاد تھے اور اردو کے ٹوٹکے

گودوں کی کھلائی ہوئی تھی کسی کے سبق میں عربی کا کوئی محاورہ یا ضرب المثل آجاتی تو اردو فارسی کا ہم معنی محاورہ یا ضرب المثل بھی بیان کر دیا کرتے تھے عربی شعر کوئی آتا تو اسی مضمون کا کوئی فارسی یا اردو شعر سنا دیا کرتے تھے بعض علمی مسائل میں مولانا اپنی خاص رائے رکھتے وہ طلبا کے سامنے بے تکلف بیان کر دیا کرتے تھے۔

خود بھی مولانا کچھ کم علم کے حریص نہ تھے حیدر آباد میں علاوہ حفظ قرآن کے تلنگی زبان بھی سیکھی تھی اور آخر میں سنسکرت پڑھا کرتے تھے ہاتھ میں رعشہ کی وجہ سے خود تو لکھتے نہ تھے بول کر لکھواتے تھے لیکن کتاب اور اخبارات کا مطالعہ برابر کرتے تھے اور یہ مشغلہ اس وقت ختم ہوا جب ضعیف العمری کی وجہ سے آنکھوں سے معذور ہو گئے۔

باوجود دولت مندی کے معاشرت بالکل سادہ رکھتے تھے گورنمنٹ اور حیدر آباد میں ممتاز عہدوں پر رہے لیکن سادگی نہ چھوڑی جس جگہ بیٹھا کرتے تھے وہاں کوئی سامانِ تکلف نہ تھا نہ کسی قسم کی آرائش تھی لباس کی طرح کھانا بھی سادہ ہی کھایا کرتے تھے

وضعداری ویسی ہی تھی جیسی پرانے لوگوں میں ہوا کرتی تھی چاندنی چوک میں شمس العارفین کی دکان پر بعد نماز عصر روزمرہ بیٹھا کرتے تھے اور مغرب کی نماز پڑھ کر واپس جاتے تھے پھر بجائے

اس دکان کے بعد میں حاجی سراج الدین جفت فروش کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آتا تھا چاہے مینھ برستا ہو یا آندھی چلتی ہو لیکن مولانا برابر اپنے وقت پر آتے تھے اور وقت پر جاتے تھے حاجی سراج الدین کی وفات کے بعد مہر آلہی صاحب کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے مولانا اسوقت بلامدد کے چل پھر نہیں سکتے تھے اس لئے مہر الہی صاحب اپنے صاحبزادہ کو لے کر آتے تھے اور مولانا کو سہارا دے کر لے جاتے تھے وفات سے تھوڑے دن پہلے جب طاقت نے بالکل ہی جواب دیدیا تو اس وقت مجبور ہو گئے پھر کہیں نہیں جاتے تھے۔"

بعض لوگوں کی ایک عامیانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خود یا ان کے مرید اور ہم صحبت دھمکی آمیز گمنام خطوط بھیجا کرتے ہیں چنانچہ امہات الامۃ کی اشاعت پر جو ہنگامہ برپا کیا گیا تھا اس کا ایک جزیہ بھی تھا کہ مولانا کے پاس گمنام خطوط بھیجے جاتے تھے ہر خط میں یہ لکھا جاتا تھا کہ تم قتل کر دیے جاؤ گے اور سر بازار پیٹے جاؤ گے لیکن مولانا کو پروا بھی نہ ہوئی اور اپنے معمول میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا جو وقت دوکان پر جا کر بیٹھنے کا تھا اس وقت برابر جاتے تھے اور مقررہ وقت تک بیٹھے رہا کرتے تھے۔

دینیات کے فاضل علامہ تھے لیکن روکھے اور خشک مزاج نہ تھے بلکہ نہایت خوش طبع ظریف بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے ایک خوبی اِن میں یہ تھی کہ بے لاگ تھے جو کچھ دل میں ہوتا تھا وہ صاف کہدیتے تھے نیک دل بھی ایسے ہی تھے کہ جن لوگوں نے اِن سے بدمعاملگی کی اور نقصان پہنچایا اِن کو درگذر کر دیا۔

وہ ایک آزاد خیال اور روشن دماغ عالم تھے لیکن نہایت راسخ العقیدہ اور پابند مذہب باوجود مذہبیت کے اِن میں تعصب نام کو نہ تھا وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ملتے تھے اور انہیں خوبیوں کی وجہ سے غیر مذہب کے لوگ بھی مولانا کی عزت کرتے تھے۔

صوم صلوٰۃ کے پابند تھے قرآن شریف کی تلاوت کا ایک خاص وقت مقرر تھا تلاوت کے بعد اِن کی طبیعت میں خاص قسم کی نرمی پیدا ہو جاتی تھی اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس وقت اِن سے جو بات کہی جاتی تھی وہ منظور کر لیتے تھے وفات سے چند سال قبل یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب قرآن شریف کی کوئی آیت پڑھتے تھے تو آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے تھے وفات سے چند روز پیشتر سے یہ حالت تھی کہ موت کو بار بار یاد کر کے روتے تھے اور قرآن شریف کی آیتیں پڑھتے رہتے تھے آخر وہ گھڑی آگئی جو ہر متنفس کو پیش آتی ہے ۲۹- اپریل کو

فالج گرا۔ مولانا کی ایک صاحبزادی ہیں اور ایک صاحبزادے
صاحبزادی تو گھر ہی پر موجود تھیں اور صاحبزادے مولوی
بشیر الدین احمد صاحب حیدر آباد میں تھے جہاں وہ ایک ممتاز عہدے پر
ملازم تھے ان کو تار دیا گیا وہ ابھی دہلی پہنچنے بھی نہ پائے تھے
کہ ۳۔ مئی ۱۹۱۲ء کو مولانا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر کے
عالم جاودانی کو جا پہنچی اور اسی روز یہ علم کا آفتاب عالم تاب
خواجہ باقی باللہ میں زیر خاک دفن کر دیا گیا خدا مرحوم کو اپنے
سایۂ رحمت میں رکھے"۔ آمین۔

محمد مہدی بھوپال

مطبع ریاست بھوپال

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

علیگڈھ کے بعد اس صوبہ میں سب سے قدیم اور مشہور اسلامی مدرسہ ہے جہاں تعلیم ذہنی کے ساتھہ مذہبی اور جسمانی تربیت کا بھی بہترین انتظام ہے - ہندوستان کے ہر صوبہ کے طلبا یہاں تعلیم پاتے ہیں - دار الاقامہ میں متعدد قابل استاد اور علماء بچوں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے اُن کے ساتھہ رہتے ہیں - مفصل حالات کے لئے دستور العمل طلب فرمائیے -

محمد الطاف حسین بی اے (علیگ)

ہیڈ ماسٹر